جلد ۱۲   شمارہ ۳   مارچ ۲۰۰۰ء   ذوالحجہ ۱۴۲۰ھ

فہرست

اس شمارے میں	محمد بلال	۲
شذرات		
''اشراق''کا اصلاح و دعوت ایڈیشن	طالب محسن	۴
ہم کیسی قربانی کر رہے ہیں جس کا...	محمد بلال	۵
قرآنیات		
البیان: البقرہ ۲: ۸۳-۸۶ (۱۴)	جاوید احمد غامدی	۹
معارف نبوی		
نیکی کا اجر	طالب محسن	۱۲
نیکی اور گناہ	طالب محسن	۱۶
مناجات		
آغاز سفر پر اذکار (۲)	ساجد حمید	۲۰
دین و دانش		
قانون سیاست (۳)	جاوید احمد غامدی	۲۲
خور و نوش میں حلت و حرمت (۲)	جاوید احمد غامدی	۲۵
مکاتیب		
مکتوب-۱	کریم الدین/جاوید احمد غامدی	۳۴
مکتوب-۲	محمد موسیٰ بھٹو/جاوید احمد غامدی	۴۲
یسئلون		
سوال و جواب	طالب محسن	۴۵
تبصرۂ کتب		
''المیہ تاریخ''	طالب محسن	۵۰
وفیات		
''نور بصیرت'' عام کرنے والے کی رحلت	محمد بلال	۵۲
ایک علمی روایت کا خاتمہ	خورشید ندیم	۵۵
ادبیات		
میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں!	محمد بلال	۶۰
حمد رب ذوالمنن	ضیاء الدین نعیم	۷۰
مریم کے نام (نظم)	جاوید احمد غامدی	۷۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس شمارے میں

''اسفارِ ہند'' مولانا وحید الدین خاں کے ملکی سفر ناموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی تمہید میں مولانا لکھتے ہیں:

''یہ سفر نامے سادہ طور پر سفر نامے نہیں ہیں بلکہ وہ وسیع تر ہندوستان کا مطالعہ ہیں۔ ان میں دوسرے فرقوں اور مذہبوں کے بارے میں تفصیلی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ گویا سفر نامہ کی صورت میں ملک کی تاریخ کا ایک مطالعہ ہے۔

راقم الحروف کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اس ملک میں مختلف فرقے مل جل کر امن کے ساتھ رہیں ...... امن کے بغیر کسی بھی قسم کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اسی کے ساتھ راقم الحروف کا ایک مستقل مشن یہ رہا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف غلط فہمیوں کو دور کرے اور اسلام کا مثبت تعارف لوگوں تک پہنچائے۔ اس کے نمونے بھی زیرِ نظر مجموعہ میں قاری کے سامنے آئیں گے۔

یہ سفر نامے بظاہر وقتی ہیں۔ مگر ان میں جن باتوں کو شامل کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دائمی ہیں۔ یہ وقتی حالات کی زبان میں ابدی قدروں کا بیان ہے۔ اس کی افادیت کسی زمانہ کے ساتھ بندھی ہوئی نہیں۔''

اسی طرح مولانا وحید الدین خاں ''سفر نامہ، غیر ملکی اسفار جلد ۱'' کے ''آغازِ کلام'' میں لکھتے ہیں:

''میں جہاں بھی گیا، اپنے ذوق کے مطابق ہر قسم کی باتیں جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس طرح میرا سفر نامہ صرف کانفرنسوں کی روداد نہیں ہے، بلکہ وہ مختلف قسم کی معلومات کا مجموعہ بن گیا ہے۔ تاہم مجھے انھی معلومات سے دلچسپی ہوتی ہے جن میں سبق ہو۔ معلومات برائے معلومات کا مجھے کوئی ذوق نہیں۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک شخص کو سفر کے دوران میں جو مشاہدات اور تجربات حاصل ہوتے ہیں ان کے اظہار میں اس کے مخصوص مزاج کا رنگ آپ سے آپ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اگر سفر نامہ نگار علمی اور دعوتی مزاج کا حامل ہو گا تو اس کے سفر نامے میں بھی علمی اور دعوتی باتیں فطری طور پر نسبتاً زیادہ جگہ پا لیں گی۔ اگر ایک شخص معاش کو انسان کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھنے کا قائل ہو گا تو اس کے سفر نامے میں کارخانوں، فیکٹریوں، دکانوں،

چیزوں کے نرخوں کی باتیں دوسری سب باتوں سے زیادہ نمایاں ہو جائیں گی۔

مولانا وحید الدین خاں ایک علمی اور دعوتی شخصیت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر ناموں میں علم اور دعوت کی خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہوتی ہیں۔

اس وقت ''ادبیات'' کے ذیل میں ''میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں!'' کے عنوان سے ایک سفر نامہ طبع کیا گیا ہے۔ امید ہے قارئینِ کرام سفر نامے کے بارے میں اوپر مذکور امور ذہن میں رکھ کر اس کا مطالعہ کریں گے۔

''مکاتیب'' کے تحت ''اشراق'' میں خطوط کی اشاعت کا اہتمام وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے، مگر اب ہم نے اس سلسلے کو مستقل طور پر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لیے مدیرِ ''اشراق'' کے نام اُس وقت کے علمی خطوط کا انتخاب کیا ہے جب ''اشراق'' جاری ہوا ہی تھا اور ''المورد'' ابھی اپنے ابتدائی خدوخال واضح کر رہا تھا۔

ان خطوط کا مطالعہ کرتے وقت ازراہِ کرم ان کے اوپر درج تاریخوں کو ضرور پیشِ نظر رکھا جائے، بصورتِ دیگر ان میں زیرِ بحث آنے والے بعض مسائل کی تفہیم میں دشواری ہو سکتی ہے۔

''وفیات'' کے ذیل میں پروفیسر مرزا محمد منور مرحوم پر ایک تحریر شائع کی گئی ہے۔ دراصل مرزا صاحب کی وفات اس موقع پر ہوئی جب ''اشراق'' اپنی تیاری کے آخری مراحل میں داخل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس وقت مرزا صاحب کے بارے میں مختصر تحریر لکھی گئی ہے۔ اگلے شمارے میں ان شاء اللہ آپ کے کام کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا جائے گا۔

مولانا سید ابوالحسن ندوی مرحوم کی وفات پر تفصیلی تحریر پچھلے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ اس اشاعت میں بھی ندوی صاحب پر ایک مختصر تحریر شائع کی گئی ہے۔ یہ تحریر ان کی شخصیت کے ایک خاص پہلو کو نمایاں کرتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ندوی صاحب کی شخصیت اتنی بڑی ہے کہ صرف ایک تحریر سے آپ کا حق ادا نہیں ہوتا۔

اس کے عوہ ''شذرات''، ''قرآنیات''، ''معارفِ نبوی''، ''مناجات''، ''دین و دانش'' اور ''دیسئلون'' کے سلسلے حسبِ سابق موجود ہیں۔

—— محمد بلال

شذرات

''اشراق'' کا اصلاح و دعوت ایڈیشن

''اشراق'' ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ اس نے اس ملک میں قرآنِ مجید کی خالص تعلیمات کے احیا کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کا ہر شمارہ اس کی اپنے مقصد کی طرف یکسوئی پر گواہ ہے۔ ''اشراق'' کے مدیر اور ان کے رفقا نے کوشش کی کہ وہ لوگوں کے دلوں کو حق کے سمجھنے اور حق ہی کو اختیار کرنے کے لیے تیار کریں۔ ان کو تعصبات سے بچائیں اور صرف خدا کی رضا کے لیے رد و قبول کے فیصلے پر آمادہ کریں۔ اس غرض کے لیے ''اشراق'' میں زیادہ تر علمی اندازِ تحریر اختیار کیا گیا ہے۔

''اشراق'' میں لکھنے والوں کی اس سعی سے مقصود آخرت کی فلاح رہی ہے۔ چنانچہ علمی مضامین کے ساتھ ساتھ عام فہم اور دعوتی تحریریں بھی ''اشراق'' کے صفحات پر شائع ہوتی رہی ہیں۔ ہمارے ملک کی آبادی کا بڑا حصہ اسی نوع کی تحریریں پڑھ سکتا اور نہ ان کے معانی اخذ کر سکتا ہے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ ''اشراق'' کے ان قارئین کے لیے الگ رسالہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ''اشراق'' کے اصلاح و دعوت ایڈیشن کے اجرا کا فیصلہ کیا ہے۔ اس ایڈیشن کا آغاز ان شاء اللہ اپریل ۲۰۰۰ سے ہو گا۔ اس کے بنیادی سلسلے قرآنِ مجید کی عام فہم شرح اور اقوالِ رسول کی سادہ تبیین ہو گی۔ اس کے علاوہ سادہ دعوتی مضامین، سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور احوالِ صحابہ سے دینی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا جائے گا۔ آغاز میں اس کے صفحات کی تعداد ۲۴ اور قیمت ۵ روپے رکھی گئی ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ یہ ایڈیشن عام آدمی کی زندگی میں دینی تبدیلی کا نقیب بن جائے، اس کے لیے دین کے فہم کا ذریعہ ہو اور اسے پیش آنے والے عملی مسائل کے حل کا باعث بنے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کوشش کو کامیاب کرے۔ اسے ہمارے لیے بھی آخرت کی کامیابی کا زینہ بنائے اور اس کے پڑھنے والوں کو بھی

جنت میں لے جانے کا سبب ہو۔

—— طالب محسن

ہم کیسی قربانی کر رہے ہیں جس کا....

عید الاضحیٰ کی نماز جیسے ہی ختم ہوئی تو اجتماع گاہ سے بہت سے لوگ اٹھے، اپنی سواریوں کی طرف بڑھے اور اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔ میں نے سوچا: ''نمازِ عید کا خطبہ سننا بھی ضروری ہوتا ہے مگر یہ لوگ صرف نماز پڑھ کر ہی کیوں چلے گئے ہیں؟'' پھر خیال آیا: ''اچھا! یہ لوگ اپنا قربانی کا جانور صبح صبح ہی ذبح کر کے جلدی فارغ ہونا چاہتے ہیں۔'' اس خیال کے ساتھ ہی عید الاضحیٰ پر جانور کی قربانی کا فلسفہ میرے تحت الشعور سے شعور کے خانے میں منتقل ہوا۔ اس فلسفے کی روشنی میں نماز کا خطبہ چھوڑ کر جانے والوں، خود کو اللہ کے حوالے کرنے کے ایک بہت معمولی عمل سے گریز کرنے والوں پر سوچا تو حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔

عید الاضحیٰ کا فلسفہ کیا ہے؟ عید الاضحیٰ اسلامی مہینے ذوالحجہ میں منائی جاتی ہے۔ اسی مہینے کے ابتدائی دنوں میں مکہ معظمہ میں لاکھوں مسلمان حج کے مناسک ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ انھی مناسک کو ادا کرتے ہوئے ایک موقع پر وہ صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے مابین پھیرے لگاتے ہیں۔ یہ پھیرے اصل میں حضرت ابراہیم کے ان پھیروں کی یادگار ہیں جو انھوں نے حضرت اسماعیل کو اللہ کی راہ میں قربان کرتے وقت لگائے تھے۔ شریعتِ ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھانا مقصود ہوتا تھا یا خدا کی نذر کرنا پیشِ نظر ہوتا تھا، وہ بار بار معبد یا قربان گاہ کے گرد پھیرے لگاتا تھا۔ حضرت ابراہیم نے جس طرح اپنے آپ کو اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو خدا کے حوالے کیا تھا، وہ انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ اسی طرح حضرت اسماعیل کا حکمِ الٰہی کے آگے سر جھکانا بھی دنیاے تسلیم و رضا کی روشن ترین مثال ہے۔ حضرت ابراہیم نے جب حضرت اسماعیل سے پوچھا کہ خدا کا حکم ہوا ہے کہ میں تجھ کو قربان کر دوں تو انھوں نے نہایت استقلال کے ساتھ کہا: یہ سر حاضر ہے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں لفظ 'اسلما' استعمال کیا جو 'اسلام' سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی تسلیم اور

حوالے کر دینے کے ہیں۔ اسی نسبت سے حضرت ابراہیم کے پیروکاروں کا نام 'مسلم' رکھا گیا۔

ایک باپ ہی جانتا ہے کہ جب اس کا بچہ اس کے ساتھ چلنے کے قابل ہوتا ہے تو اس کے جذبات کیا ہوتے ہیں اور جب وہ بچہ اس کے ساتھ چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کرتا ہے تو اس کے اندر خوشی کی کیسی بڑی بڑی لہریں اٹھتی ہیں۔ اپنے بچے کے اندر بڑھتی ہوئی توانائی اسے کس طرح اپنے اندر بڑھتی ہوئی توانائی محسوس ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم کا معاملہ یہ تھا کہ انھوں نے شرک کی غلاظت میں لتھڑی ہوئی اپنی قوم میں ندائے اصلاح بلند کی مگر کسی نے بھی ان کی بات پر کان نہ دھرا۔ حتیٰ کہ آپ کو آگ میں جلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے وہاں سے ہجرت کی۔ ایک تو آپ بے اولاد تھے دوسرے اپنے خاندان اور قبیلے سے کٹ کر نئی جگہ آ گئے، یہاں فطری طور پر آپ کو ساتھی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا آپ نے دعا فرمائی: "اے رب، ان برے لوگوں کی جگہ مجھے اچھے ساتھی دے۔" دعا قبول ہوئی۔ آپ کے ہاں ایک فرزند کی ولادت ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۶ سال تھی۔ آپ کی دل جمعی کا سامان ہو گیا، لیکن جب آپ کا یہ اکلوتا لڑکا آپ کے ساتھ چلنے پھرنے اور چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے مرحلے میں داخل ہوا تو آپ کی زندگی آزمایش کے سخت ترین مرحلے میں داخل ہو گئی۔ قرآنِ مجید میں ہے:

"پس جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچا، اس نے کہا: اے میرے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ تو غور کر لو تمھاری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اے میرے باپ، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی تعمیل کیجیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدموں میں پائیں گے۔ پس جب دونوں نے اپنے تئیں اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیم نے اس کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔"

(الصافات ۳۷: ۱۰۲-۱۰۳)

ان آیات کی تفسیر میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے کے جذبے کو مزید نمایاں کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اصل مرحلہ یعنی قربانی کا بیان ہو رہا ہے۔ 'اسلام' کے معنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینے کے ہیں۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں امتحان کے لیے آمادہ ہو گئے۔ باپ نے بیٹے کو ذبح کر دینے کے لیے چھری نکال لی اور بیٹے نے اپنے آپ کو ذبح کر دینے کے لیے حوالے کر دیا۔ 'وتله للجبين' اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔ پیشانی کے بل پچھاڑنے کی توجیہ بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ حضرت ابراہیم نے چاہا کہ ذبح کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وقت بیٹے کا محبوب چہرہ سامنے نہ ہوتا کہ رقتِ قلب چھری چلانے میں مانع نہ ہو لیکن یہ توجیہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے جو باپ اس طرح اپنے اکلوتے اور محبوب لختِ جگر پر چھری چلانے کے لیے آستینیں چڑھا لے گا وہ اس قسم کی تسلیوں کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے بیٹے کو سجدہ کی حالت میں قربان کرنا چاہا اس وجہ سے پیشانی کے بل پچھاڑا۔ سجدہ کی ہیئت خدا کے قرب کی سب سے زیادہ محبوب ہیئت اسلام میں بھی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے 'واسجدو اقترب' (سجدہ کر اور اپنے رب سے قریب تر ہو جا) اور اس کی یہ حیثیت قدیم مذاہب میں بھی مسلّم رہی ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بیت اللہ نہ تو تعمیر ہوا تھا اور نہ عبادت کے لیے کوئی متعین قبلہ ہی تھا۔ اگر کوئی متعین قبلہ ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم بھی بیٹے کو قبلہ رخ لٹاتے جس طرح ہم جانوروں کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ لٹاتے ہیں۔" (تدبرِ قرآن، ج ۶ ص ۴۸۵-۴۸۶)

لہٰذا حاجی صفا اور مروہ کے مابین پھیرے لگا کر اور منیٰ میں جانور ذبح کر کے دراصل علامتی طور پر اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ اے عالم کے پروردگار اگر کبھی تیرا دین ہماری قیمتی ترین چیز قربان کرنے کا تقاضا کرے گا تو سیدنا ابراہیم کی طرح ہم اس کے آگے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔

حج کی اس عظیم عبادت میں ذہنی اور روحانی طور پر شریک کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر حاجیوں کو جانور کی قربانی کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عید الاضحیٰ پر جانور ذبح کرنے کے پیچھے کس قدر غیر معمولی فلسفہ و حکمت کارفرما ہے۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر سوچا جائے کہ کیا عید الاضحیٰ پر جانور کی قربانی کرتے وقت ہم پر خود کو اللہ کے حوالے کرنے کے عزم کی وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جو اِس ''رسم'' کی حقیقی روح ہے؟

اگر نماز کے بعد چھوٹا سا خطبہ سننا گوارا نہیں ہے تو یہ کیسی ''حوالگی'' ہے جس کا اظہار جانور ذبح کر کے کیا جا رہا ہے؟ اگر جانور ذبح کرنے کے سوا ہماری زندگی میں نہ پہلے نماز کا التزام تھا نہ آیندہ ایسا کوئی ارادہ ہے، نہ پہلے انفاق کیا تھا نہ آیندہ ایسا کوئی ارادہ ہے، نہ پہلے دین کی نصرت کی تھی اور نہ آیندہ ایسا کوئی ارادہ ہے، نہ پہلے دل کو پاک کرنے کا کوئی اہتمام تھا نہ آیندہ ایسا کوئی ارادہ ہے، نہ پہلے جھوٹ، ملاوٹ، رشوت، بدگمانی، غیبت سے گریز کیا تھا نہ آیندہ ایسا کوئی ارادہ ہے، اگر ہم دانش ور ہیں تو نہ پہلے قرآن کو اپنے خیالات کا محور و مرکز بنایا نہ آیندہ ایسا کوئی ارادہ ہے، اسی طرح اگر ہم حکمران ہیں تو نہ پہلے ریاست کے بارے میں احکامِ الٰہی پر عمل کیا تھا نہ آیندہ ایسا

کوئی ارادہ ہے تو ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ ہم کیسی قربانی کر رہے ہیں جس کا قربانی کے فلسفے کے ساتھ کوئی حقیقی تعلق ہی نہیں ہے اور قربانی کے اصل تقاضوں کو مجروح کرتی ہوئی جو زندگی ہم گزار رہے ہیں، اس میں قربانی کر کے کہیں ہم دین و شریعت کے ساتھ مذاق کرنے کی سنگین جسارت تو نہیں کر رہے؟

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۱۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

اور[۲۰۳] یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد[۲۰۴] لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور والدین[۲۰۵] کے ساتھ اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں[۲۰۶] کے ساتھ حسنِ سلوک

۲۰۳۔ اتمامِ حجت کا جو مضمون پیچھے سے چلا آرہا ہے، یہ اب اس میں یہود کو ان کے نقضِ عہد کی یاد دہانی کی جارہی ہے تاکہ اُن پر واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے جس عہد و میثاق کو وہ اپنا سرمایۂ فخر و ناز سمجھتے ہیں، اُس کے ساتھ اُن کا رویہ کیا رہا ہے۔

۲۰۴۔ اس سے مراد وہ ابتدائی عہد ہے جو بنی اسرائیل سے توحید اور ادائے حقوق سے متعلق لیا گیا۔

۲۰۵۔ اللہ تعالیٰ کا حق بیان کرنے کے فوراً بعد یہ والدین کے حق کا ذکر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اگر کوئی ہے تو انھی کا ہے۔

۲۰۶۔ والدین اور اقربا کے معاً بعد یتیموں اور مسکینوں کا ذکر اسلامی معاشرے میں اُن کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَّذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا
الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾
وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ مِّنۡ

کروگے[۲۰۷]۔ اور (عہد لیا کہ) لوگوں سے اچھی بات کہو[۲۰۸] اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر تم میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب (اُس سے) پھر گئے اور (حقیقت یہ ہے کہ) تم پھر جانے والے ہی لوگ ہو[۲۰۹]۔ ۸۳

اور یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد[۲۱۰] لیا کہ آپس میں خون نہ بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو[۲۱۱]۔ پھر یہ تمھی ہو کہ اپنوں کو

۲۰۷۔ حسنِ سلوک اداے حقوق سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ دوسروں کے حقوق نہایت خوبی کے ساتھ ادا کر دیے جائیں۔

۲۰۸۔ یہ کم و بیش وہی بات ہے جو اسی سورہ کی آیات ۲۶۲، ۲۶۳، سورۂ نساء (۴) کی آیات ۵، ۸، ۹ اور سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۲۸ میں بالترتیب 'قول معروف و مغفرۃ'، 'قولوا لھم قولاً معروفاً'، 'ولیقولوا قولاً سدیداً' اور 'فقل لھم قولًا میسوراً' کے الفاظ میں کہی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اداے حقوق کے ساتھ ان حق داروں کی عزتِ نفس بھی ہر حال میں ملحوظ رہنی چاہیے۔ لہٰذا ان سے جو بات بھی کی جائے، نہایت شریفانہ اور مہذب انداز میں کی جائے۔ سختی اور ترش کلامی کا رویہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ اداے حقوق کے ساتھ یہ چیز نہ ہو تو آدمی کا سارا احسنِ سلوک غارت ہو سکتا ہے۔

۲۰۹۔ یعنی یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے جو تم سے اتفاقاً صادر ہو گیا ہو، بلکہ تمھارا مستقل رویہ یہی رہا ہے۔

۲۱۰۔ یہ اب ایک دوسرے عہد کا حوالہ دیا ہے۔

۲۱۱۔ یعنی جب یہ اقرار تم نے کیا تو تمھارے بزرگوں کی پوری جماعت اُس وقت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود تھی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا طریقہ یہی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے ہمیشہ سب لوگوں کے سامنے آگاہ کرتے اور پھر پوری جماعت سے اُن کی پابندی کا عہد لیتے تھے۔

دِيَارِكُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ
فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ط وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى
تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ط اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ
بِبَعۡضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ج وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ
يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ
الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۸۶﴾ ع

قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو، اس طرح کہ ظلم اور حق تلفی کے ساتھ ان کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو، اور اگر وہ قیدی ہو کر آئیں تو فدیہ دے کر اُنھیں چھڑاتے ہو[۲۱۲] دراں حالیکہ اُن کا نکالنا ہی سرے سے تمھارے لیے جائز نہ تھا۔ پھر کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصے کو مانتے اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو؟ سو تم میں سے جو یہ کرتے ہیں، اُن کی سزا اِس دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور قیامت کے دن وہ سخت سے سخت عذاب میں پہنچا دیے جائیں گے۔ (تم یہی کرتے ہو) اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے ـــــ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت دے کر دنیا خرید لی[۲۱۳]، اس لیے (قیامت میں اب) نہ اِن کا عذاب ہی ہلکا ہوگا اور نہ کوئی مدد انھیں پہنچے گی۔ ۸۴-۸۶

۲۱۲۔ اس کی صورت تاریخ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہلے دشمنوں سے ساز باز کر کے اپنے ہی بھائیوں کی کسی جماعت پر چڑھائی کرا دی جاتی۔ پھر قتل و غارت کے بعد جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں قیدی ہو کر مدد کے طالب ہوتے تو اُن کو چھڑا کر قومی ہم دردی اور حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا جاتا۔

۲۱۳۔ یعنی آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دی۔ اس طرح کے مواقع پر عربی زبان میں یہ تعبیر اسی مفہوم کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔

[باقی]

طالب محسن

نیکی کا اجر

(مشکوۃ، کتاب الایمان: حدیث ۴۴:۴۵)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إذا أحسن أحدکم إسلامه، فکل حسنة یعملها تکتب له بعشر أمثالها إلی سبع مائة ضعف. وکل سیئة یعملها تکتب بمثلها حتی لقی الله.

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے دین کو بہترین بنالیتا ہے تو ہر نیکی جو وہ کرتا ہے دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جاتی ہے۔ اور ہر برائی جو وہ کرتا ہے اسی کے برابر (یعنی ایک ہی) لکھی جاتی ہے۔“

لغوی بحث

أحسن : بہترین طریقے سے کرنا۔ یہ لفظ قرآنِ مجید میں بھی بہت استعمال ہوا ہے۔ لفظ احسان اسی سے مشتق

ہے جسے پانے کا طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثِ جبریل میں مروی ہے۔

حسنة: خوبی، بھلائی۔ یہ لفظ جہاں اچھے حالات کے لیے آتا ہے وہاں نیکیوں کے لیے بھی آتا ہے۔

سیئة: برائی۔ یہ لفظ چھوٹی بڑی بدیوں کے لیے عام ہے۔

لقی اللّٰه: اللہ سے ملے۔ یہاں اس سے موت مراد ہے۔

متون

یہ روایت معروف روایات میں سے ہے۔ اسے متعدّد محدثین نے روایت کیا ہے۔ بعض روایات میں 'إذا تحدث' کے بجائے 'إذا هم' ہے۔ اسی طرح ترمذی نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بیان کرنے کے بعد 'من جاء بالحسنة' والی آیت بھی پڑھی تھی۔ مسلم کی ایک روایت جامع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے اجزا مختلف صورتوں میں الگ الگ روایت کی شکلمیں کتبِ حدیث کی زینت بنے ہیں:

عن ابوهريرة رضى الله عنه عن محمد صلى الله عليه وسلم فذكر أحاديث منها. قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال الله عز و جل: إذا تحدث عبدى بأن يعمل حسنة فأنا أكتبها له حسنة ما لم يعمل. فإذا عملها فأنا أكتبها له بعشر أمثالها. و إذا تحدث بأن يعمل سيئة فأنا أغفرها له ما لم يعملها فإذا عملها فأنا أكتبها له بمثلها. و قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قالت الملائكة: ذاك عبدك يريد أن يعمل سيئة و هو أبصر به. فقال: ارقبوه فإن عملها فاكتبوها له بمثلها

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے ان سے بہت سی باتیں روایت کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب میرا بندہ نیکی کرنے کے بارے میں سوچتا ہے تو میں اسے اس کی ایک نیکی کے طور پر لکھ لیتا ہوں۔ پھر جب وہ اس پر عمل کر لیتا ہے تو میں اس نیکی کو دس گنا کر کے لکھ لیتا ہوں۔ اور جب کوئی برائی کرنے کے بارے میں سوچتا ہے تو میں اس ارادے کو معاف کر دیتا ہوں جب تک وہ کر نہیں ڈالتا۔ پھر جب وہ ارتکاب کر لیتا ہے تو میں اسے اس کی ایک ہی برائی لکھتا ہوں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا کہ فرشتے کہتے ہیں: یہ تیرا بندہ برائی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

و إن ترکھا فاکتبوھا لہ حسنة إنما ترکھا من جرای. وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا أحسن أحدکم إسلامہ فکل حسنہ یعملھا تکتب لہ بعشر أمثالھا إلی سبع مائة ضعف و کل سیئة یعملھا تکتب بمثلھا حتی یلقی اللہ.

(مسلم، کتاب الایمان، باب ۵۹)

کرنا چاہتا ہے اور وہ اس کے درپے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ان سے کہتے ہیں: اس پر نظر رکھو۔ اگر یہ کر ڈالے تو اسے اس کی ایک برائی لکھ لو اور اگر چھوڑ دے تو اس کی ایک نیکی لکھ دو۔ اس نے میری وجہ سے ایسا کیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: جب کوئی شخص اپنے اسلام کو بہترین بنالیتا ہے تو اس کی ہر نیکی جو وہ کرتا ہے دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جاتی ہے اور ہر برائی جو وہ کرتا ہے ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مسلم کی یہ روایت ایک ہی موقع کی گفتگو معلوم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری کسی کتاب میں یہ روایت اس صورت میں درج نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کے شاگرد وہب بن منبہ نے ایک ہی مضمون کی مختلف روایات کو یک جا کر دیا ہے۔ اور اس کے قرائن اس متن میں بھی موجود ہیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ گفتگو تو ایک ہی موقع کی ہو لیکن روایت میں درمیان کی بہت سی باتیں حذف ہو گئی ہیں۔ بہرحال اس روایت میں بیان کی گئی یہ حقیقت کہ برائی کے خیال کو معاف کر دیا جاتا ہے اور نیکی کے خیال کو ایک نیکی قرار دیا جاتا ہے اور یہ بات بھی کہ ایک برائی ایک ہی لکھی جاتی ہے اور ایک نیکی دس گنا یا اس سے زیادہ لکھی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بے پایاں رحمت کو واضح کرتی ہے۔

معنی

یہ روایت سرتاسر قرآنِ مجید ہی کے ایک نکتے کا بیان ہے۔ سورۂ انعام میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (۶:۱۶۰)

''جو ایک نیکی کما کر لایا تو اس کے لیے یہ دس کے برابر ہوں گی اور جس نے ایک برائی کی اسے اس کے برابر ہی جزا دی جائے گی۔ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اسی طرح سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ. (۲:۲۶۱)

''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے راستے میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ایک بیج کی ہے ۔ جس پر سات بالیاں آئیں اور ہر بالی میں سو دانے تھے۔ اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے اور اللہ بڑی گنجایش والا اور علم والا ہے۔''

سورۂ انعام کی آیت کے سیاق و سباق اور سورۂ بقرہ کی آیت کے الفاظ سے وہ نکتہ واضح ہوتا ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'إذا أحسن أحدكم اسلامه' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ در حقیقت کسی نیکی کے محرک، جذبے اور خوبی کی مختلف صورتیں ہیں جن کے نتیجے میں کوئی نیکی سات سو گنا تک اجر کا باعث بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب ہم کوئی نیک عمل کرتے ہیں تو جہاں اس چیز کی ضرورت ہے کہ ہماری نیت صرف خدا کی رضا ہو وہاں اس عمل کا درست ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ عمل جو محض چھدا اتارنے کے لیے کیا گیا ہو بسا اوقات اللہ کی ناراضی کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی طرح کسی نیکی کے کرنے میں حالات کی نامساعدت بھی اجر کی کمی بیشی کا باعث بنتی ہے۔ جتنے مشکل حالات میں کوئی نیکی کی جاتی ہے اس کا اجر اتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں لوگ بالعموم برائی کے فروغ اور نیکی کرنے میں حائل رکاوٹوں کا شکوہ کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس اصول کی روشنی میں دیکھیں تو اس زمانے کی چھوٹی چھوٹی نیکیاں بھی بڑے اجر کا باعث ہوں گی۔ تمام نیکیوں کو بہترین صورت میں کرنے کے لیے جہاں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہم سب کچھ خدا کے سامنے کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح ہمیں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے 'لقد كان لكم فى رسول الله أسوة حسنة' (احزاب ۳۳: ۲۱) کہہ کر ہمارے لیے نشاناتِ راہ متعین کر دیے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کتابیات

بخاری، کتاب الایمان، باب ۳۰، کتاب التوحید، باب ۳۵۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۵۹۔ ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ۷۔ مسند احمد ابی ہریرہ۔

نیکی اور گناہ

عن أبی أمامة رضی الله عنه أن رجلا سأل رسول الله صلی الله علیه وسلم: ما الایمان؟ قال: إذا سرتک حسنتک و ساء تک سیئتک، فأنت مؤمن. قال: یا رسول الله، فما الإثم؟ قال: إذا حاک فی نفسک شیء فدعه.

''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب تمھاری نیکی سے تمھیں خوشی ہو اور تمھاری برائی تمھیں بے چین کر دے تو تم مؤمن ہو۔ اس نے (پھر) سوال کیا: اے اللہ کے رسول، گناہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب کوئی چیز تمھارے جی میں کھٹکے تو تم اسے چھوڑ دو۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لغوی بحث

سر: خوش کرے، بھائے۔ یہاں اس سے دل کا اطمینان مراد ہے۔

ساء: برا لگنا، ناگوار ہونا۔ یہاں اس سے کسی غلط کام کے ہونے کے بعد دل میں پیدا ہونے والی بے چینی یا اضطراب کی کیفیت مراد ہے۔

اثم: 'اثم' میں اصلاً تاخر یعنی پیچھے رہ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اب یہ لفظ ادائے حقوق میں پیچھے رہ جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ خدا کے حقوق ہوں یا بندوں کے۔

حاک: 'حاک فی صدری'، 'بات میرے دل میں گڑ گئی۔' یہ محاورہ ہے اور یہ اس موقع پر بولا جاتا ہے جب کوئی معاملہ دل پر جم کر رہ جائے۔ یعنی دل کی کھٹک۔

متون

یہ روایت بھی صاحبِ مشکوٰۃ نے مسندِ احمد سے لی ہے۔ مسند میں اس روایت کے تین متن درج کیے گئے

ہیں۔ ایک متن بعینہ وہی ہے جو صاحبِ مشکوٰۃ نے لیا ہے۔ دوسرے متن میں 'سأل' کے بجائے 'قال' اور 'فی نفسک' کی جگہ 'فی صدرک' ہے۔ تیسرے متن میں مضامین کی ترتیب اس متن کے برعکس ہے۔ یعنی 'اثم' سے متعلق سوال پہلے اور ایمان کے بارے میں سوال بعد میں نقل کیا گیا ہے۔ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے پہلے دونوں متن درست معلوم ہوتے ہیں اور 'فی صدرک' اور 'فی نفسک'، ہم معنی تراکیب ہیں۔

اس روایت میں سائل کا نام نہیں بتایا گیا۔ حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی مسلم کی روایت کے مطابق انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سے ملتا جلتا سوال پوچھا تھا۔ کہتے ہیں:

سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن البر و الإثم. فقال البر حسن الخلق و الإثم ما حاك فى صدرك و كرهت أن يطلع عليه الناس.

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے 'بر' اور 'اثم' کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: 'بر' حسنِ اخلاق ہے اور 'اثم' وہ جو تمھارے دل میں کھٹکے اور تو اس بات کو پسند نہ کرے کہ لوگ اس سے واقف ہوں۔"

اسی طرح حضرت خشنی رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا:

البر ما سكنت إليه النفس و اطمأن إليه القلب و الإثم ما لم تسكن إليه النفس و لم يطمئن إليه القلب.

"نیکی وہ ہے جس پر تیرا نفس سکون پائے اور تیرا دل مطمئن ہو اور برائی وہ ہے جس پر تیرا نفس بے سکون ہو اور تیرا دل غیر مطمئن۔"

ایک اور صحابی وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں آپ نے وضاحت کی:

البر ما انشرح له صدرک و الإثم ما حاك فى صدرك و إن افتاك عنه الناس.

"نیکی وہ ہے جس سے تمھارا سینہ کھل جائے اور برائی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے خواہ لوگوں نے اس کے حق میں فتویٰ دیا ہو۔"

اگرچہ یہ کہنا درست نہیں کہ اوپر والی روایت کے سائل انھی میں سے کوئی ایک ہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے کسی روایت میں بھی سوال ایمان کے بارے میں نہیں کیا گیا۔ جبکہ زیرِ بحث روایت میں پہلا سوال ایمان کے بارے میں کیا گیا ہے۔ بہر حال ان روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معنی

اس روایت میں برائی کے پہچاننے کا معیار بتایا گیا ہے۔ یہ معیار درحقیقت اس شعور پر مبنی ہے جو فاطرِ فطرت نے ہر نفس کے اندر رودیعت کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا. فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا.(الشمس ۹۱: ۷-۸)

''نفس گواہی دیتا ہے اور جیسا اسے سنوارا، پھر اسے اس کی نیکی اور بدی سمجھادی۔''

نفسِ انسانی کا یہی فہم اسے برائی پر اطمینان سے محروم کرتا اور نیکی پر داخلی مسرت سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہی اطمینان ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر درج روایات میں دل کے سکون اور انشراحِ صدر کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یہی بے اطمینانی ہے جس کے لیے دل کی کھٹک اور سکون سے محرومی کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی حالت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ اگرچہ لوگ کسی امر کے جواز کے فتوے ہی کیوں نہ دے رہے ہوں اگر تمھارا دل مطمئن نہ ہو تو اس شے کو ترک کردو۔

دوسرا پہلو ان روایات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دین کے سارے حکم ہماری فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ چنانچہ شریعت کے سارے حکم خواہ ان کا تعلق تعبدی امور سے ہو یا دنیوی امور سے، ہماری نفسیات سے ہم آہنگ، ہمارے جذبات کی تسکین اور ہماری ضروریات کی تکمیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان سے انحراف کرتے ہیں تو ہمارا داخلی وجود اس پر کبیدگی کا اظہار کرتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ہمارا یہ داخلی وجود مختلف عوامل کے تحت بعض اوقات صحیح یا غلط بات میں فرق نہیں کر پاتا۔ چنانچہ وحی کے ذریعے سے ضروری امور متعین کر دیے گئے ہیں۔ ایک اور روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

عن النعمان بن بشير سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: الحلال بين. والحرام بين. و بينهما مشبهات. لا يعلمها كثير من الناس. فمن اتقى المشبهات استبرأ لدينه و عرضه. و

''حضرت نعمان بن بشیر روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: حلال واضح ہے۔ حرام واضح ہے۔ ان کے درمیان غیر واضح امور ہیں۔ لوگوں کی اکثریت ان (کی نوعیت) سے واقف نہیں ہوتی۔

من وقع فی الشبهات کراع یرعی حول الحمی یوشک أن یواقعه. ألا و لکل ملک حمی. ألا إن حمی الله فی أرضه محارمه، ألا إن فی الجسد مضغة. إذا صلحت صلح الجسد کله. وإذا فسدت فسد الجسد کله. ألا وهو القلب.(بخاری کتاب الایمان، باب ۳۷)

چنانچہ جو ان غیر واضح امور سے بچ گیا وہ اپنے دین اور عزت کے معاملے میں بری ہو گیا اور جو ان معاملات میں پڑ گیا اس کی مثال اس گڈریے کی طرح ہے جو کسی کی چراگاہ کے کنارے کنارے اپنا ریوڑ چراتا ہے۔ لہٰذا خطرہ رہتا کہ اس میں جا پڑے۔ سنو، زمین پر خدا کی چراگاہ اس کے محرمات ہیں۔ سنو، جسم میں ایک لو تھڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ سنو، یہ لو تھڑا دل ہے۔‘‘

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس روایت میں دل کی درستی اور مشتبہ امور سے گریز کے مابین جو تعلق بیان ہوا ہے، اس سے زیرِ بحث روایت کے اس پہلو کی وضاحت ہوتی ہے کہ بندہ مؤمن کا دل نادرست کو پہچانتا ضرور ہے، لیکن پہچان کی اہلیت کو فعال رکھنے کے لیے مشتبہ امور سے گریز ضروری ہے۔

کتابیات

مسند احمد، عن ابی امامہ، عن نواس بن سمعان، عن خشنی، عن وابصہ بن معبد۔

مناجات

ساجد حمید

آغازِ سفر پر اذکار

(۲)

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَالْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ وَدَعْوَةِ الْمَظْلُومِ وَسُوءِ الْمَنْظَرِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ.

اے اللہ، ہم سفر کی مشقت، منزلِ واپسیں کی برائی، خوش حالی کے بعد تنگ حالی، مظلوم کی بد دعا اور اہلِ خانہ، اولاد اور مال و دولت میں حادثوں سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس دعا میں پہلی دعا کے مقابلے میں صرف 'الحور بعد الكور ودعوة المظلوم' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ لٰہذا ہم شرح کرتے ہوئے انھی جملوں تک محدود رہیں گے۔

' الحور بعد الكور' سے ان حالات سے پناہ مانگی گئی ہے جو سفر کے نتائج سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک مسافر سفر پر جانے سے پہلے اچھے حالات میں تھا اور وہ حالات کو مزید بہتر کرنے کے لیے کسی دوسرے علاقے میں جانے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کا وہ چلتا ہوا کاروبار جس کو وہ چھوڑ کر جا رہا ہوتا ہے وہ تو بند ہو گیا اور دوسرے شہر میں جا کر بھی وہ ناکام ہو جائے تو یہ 'الحور بعد الكور' کی ایک مثال ہو گی۔ یہ حالت دوسرے علاقے میں کاروبار چل جانے کے بعد چھوڑ کر اپنے وطن آنے پر بھی ہو سکتی ہے۔

'الحور بعد الكور' سے صرف مالی حالات ہی کی خوش حالی مراد نہیں ہے بلکہ اس میں جانی مالی اور سماجی حالات سب شامل ہیں۔ سفر کے ارادہ و ترک کے اثرات آدمی کے سماجی تشخص پر بھی پڑ سکتے ہیں۔ اور اس سے

جان ومال کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔

’ودعوة المظلوم‘ پورا جملہ یوں ہے ’ودعوة الْمظلو م علی الظالم‘ یعنی میں مظلوم کی ظالم کے خلاف دعا سے پناہ چاہتا ہوں۔ اس دعا سے مراد یہ ہے کہ میں ظالم بننے سے پناہ چاہتا ہوں۔ انبیا کی نظر بعض ایسے امور پر آسانی سے چلی جاتی ہے، جو بڑے بڑے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ سفر اختیار کرنے کے کئی سبب ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات آدمی لوگوں سے قرض لے لیتا، کمزور لوگوں سے کچھ چیزیں اینٹھ لیتا اور پھر ان کی طرف سے مطالبہ اور نالش وغیرہ سے بچنے کے لیے اپنی بستی اور علاقے کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس طرح آدمی دوسروں پر ظلم کے لیے بھی سفر اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں دعا کرنے والے کے لیے یاد دہانی کا سامان رکھا ہے کہ وہ اس دعا کے ذریعے سے ایسے کسی ظلم کو وجود میں لانے سے رک جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میزان

جاوید احمد غامدی

قانون سیاست

(۳)

[نئی اشاعت کے لیے مصنف کی طرف
سے نظرِ ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ دینی فرائض

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. (الحج ۲۲: ۴۱)

''(یہ اہلِ ایمان وہ لوگ ہیں کہ) اگر ہم ان کو (عرب کی) اِس سر زمین میں اقتدار بخشیں گے تو نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔''

سورۂ حج کی یہ آیت وہ دینی فرائض بیان کرتی ہے جو کسی خطۂ ارض میں اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی پر عائد ہوتے ہیں۔ نماز قائم کی جائے، زکوٰۃ ادا کی جائے، معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے، یہ چار باتیں اس آیت میں مسلمانوں پر ان کی اجتماعی حیثیت میں لازم کی گئی ہیں۔

قرآن کے اس حکم کی تعمیل میں ریاست کی سطح پر نماز قائم کرنے کے لیے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے قائم کی ہے، اس کی رو سے:

(ا) لوگوں کو اس بات کا پابند کیا جائے گا کہ وہ اگر مسلمان ہیں تو اپنے ایمان و اسلام کی شہادت کے طور پر مسجدوں میں حاضر ہوں اور نماز ادا کریں۔

(ب) مسجدوں کا اہتمام اور ان کے لیے ائمہ کا تقرر حکومت کرے گی۔

(ج) نمازِ جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت، ریاست کے صدر مقام کی مرکزی جامع مسجد میں سربراہِ مملکت، صوبوں میں گورنر اور مختلف انتظامی وحدتوں میں ان کے عمال کریں گے۔

اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں جو سنت قائم کی ہے، اس کی رو سے ریاست کے مسلمان شہریوں میں سے ہر وہ شخص جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں مقرر یہ حصہ اپنے سرمایے سے الگ کر کے اسے لازماً حکومت کے حوالے کر دے گا اور حکومت دوسرے مصارف کے ساتھ اس سے اپنے حاجت مند شہریوں کی ضرورتیں، ان کی فریاد سے پہلے ان کے دروازے پر پہنچ کر پوری کرنے کی کوشش کرے گی۔

معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کے لیے قرآنِ مجید کا حکم یہ ہے کہ ریاست کی طرف سے ایک جماعت باقاعدہ مقرر کی جائے جو لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے، انھیں معروف پر قائم رکھے اور منکر سے روک دے۔ اس زمانے کی تعبیر اختیار کیجیے تو گویا قرآن کا منشا یہ ہے کہ فوج اور پولیس کی طرح ایک محکمہ قانونی اختیارات کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بھی ریاست کے نظام میں قائم ہونا چاہیے جو اپنے لیے متعین کردہ حدود کے مطابق اس کام کو انجام دینے کے لیے ہمہ وقت سر گرم عمل رہے۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (۳:۱۰۴)

”اور تمھارے اندر سے ایک جماعت اس کام پر مقرر ہونی چاہیے کہ وہ بھلائی کی دعوت دے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روک دے۔ اور جو لوگ یہ اہتمام کریں گے، وہی فلاح پائیں گے۔“[۵]

اسلامی ریاست کے دینی فرائض یہی ہیں۔ دنیا میں جو ریاست بھی قائم ہوتی ہے، وہ امن اور دفاع اور ملک کی

۵۔ یہ حکم اس وقت دیا گیا، جب ہجرت کے بعد مسلمانوں کی ایک باقاعدہ ریاست مدینہ میں قائم ہو گئی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مادی خوش حالی کے لیے سعی و جہد تو بہر حال کرتی ہی ہے، لیکن محض ایک ریاست سے آگے بڑھ کر جب وہ اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کرتی ہے تو اس سے قرآن مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام اور بھلائی کو پھیلانے اور برائی کو مٹا دینے کی ذمہ داری سے کسی حال میں غافل اور بے پروا نہ ہو۔

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میزان

جاوید احمد غامدی

خور و نوش میں حلت و حرمت

(۲)

گزشتہ سے پیوستہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

زندہ جانور کے جسم سے کوئی ٹکڑا اگر کاٹ لیا جائے تو اس کا حکم بھی یہی ہونا چاہیے۔ ابو واقد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہ لوگ اونٹوں کے کوہان اور دنبوں کی چکتی کاٹ لیتے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

ما قطع من البهيمة وهي حية فهي ميتة. (ابوداؤد، کتاب الصید)

''زندہ جانور کے جسم سے جو ٹکڑا کاٹا جائے وہ مردار ہے۔''

'میتة' کا لفظ ان احکام میں عرف و عادت کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان میں اس کا ایک لغوی مفہوم بھی ہے، لیکن یہ جب اس رعایت سے بولا جائے تو اردو کے لفظ مردار کی طرح اس کے معنی ہر مردہ چیز کے نہیں ہوتے۔ اس صورت میں ایک نوعیت کی تخصیص اس لفظ کے مفہوم میں پیدا ہو جاتی ہے اور زبان کے اسالیب سے واقف کوئی شخص، مثال کے طور پر، مردہ ٹڈی اور مردہ مچھلی کو اس میں شامل نہیں سمجھتا۔

امام اللغۃ زمخشری لکھتے ہیں:

قصد ما يتفا همه الناس ويتعا رفونه

''قرآن میں لفظ 'میتة' عرف و عادت کے

فی العادة، الاتری ان القائل اذا قال، اکل فلان میتة، لم یسبق الوھم الی السبک والجراد کما لو قال، اکل دماً، لم یسبق الی الکبد والطحال، ولاعتبار العادة والتعارف قالوا، من حلف لا یاکل لحماًفاکل سبکاً لم یحنث وان اکل لحماً فی الحقیقة.

(الکشاف، ج ۱ ص ۲۱۵)

اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کوئی کہنے والا کہتا ہے: فلاں نے مردار کھایا تو ہمارا خیال کبھی مچھلی اور ٹڈی کی طرف نہیں جاتا، جس طرح اگر اس نے کہا ہوتا: فلاں شخص نے خون پیا تو ذہن کبھی جگر اور تلی کی طرف منتقل نہ ہوتا۔ چنانچہ عرف و عادت ہی کی بنا پر فقہا نے کہا ہے کہ جس نے قسم کھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا، پھر اس نے مچھلی کھالی تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی، درآں حالیکہ اس نے فی الحقیقت گوشت ہی کھایا ہے۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فرمایا ہے:

احلت لکم میتتان ودمان، فاما المیتتان فالحرت والجراد واما الدمان فالکبد والطحال.(ابنِ ماجہ، کتاب الاطعمہ)

’’تمھارے لیے دو مری ہوئی چیزیں اور دو خون حلال ہیں: مری ہوئی چیزیں مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون جگر اور تلی ہیں۔‘‘

سمندر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ’ھو الطھور ماؤہ، الحل میتة‘[6]، بھی اسی تخصیص کے ساتھ ہے اور اس میں ’میتة‘ سے مراد مردہ مچھلی اور اس طرح کی بعض دوسری چیزیں ہی ہیں جن کے لیے لفظ ’میتة‘ باعتبارِ لغت تو بولا جا سکتا ہے، لیکن عرف و عادت کی رعایت سے انھیں ’میتة‘ نہیں کہہ سکتے۔

مائدہ کی جو آیت ہم نے اوپر نقل کی ہے، اس میں ’میتة‘ کی تفصیل اور ’ما اکل السبع‘ کے بعد ’الا ما ذکیتم‘ کے الفاظ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ صرف تذکیہ ہی ہے جس سے کسی جانور کی موت اگر واقع ہو تو وہ مردار نہیں ہوتا۔ آداب و شعائر کے زیرِ عنوان ہم اسی کتاب میں بیان کر چکے ہیں کہ تذکیہ کا لفظ بطور اصطلاح جس مفہوم کے لیے بولا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی تیز چیز سے جانور کو زخمی کر کے اس کا خون اس طرح بہا دیا جائے کہ اس کی موت خون بہ جانے ہی کے باعث واقع ہو۔ جانور کو مارنے کی یہی صورت ہے جس

۶۔ النسائی، کتاب الطھارة، باب ۴۷۔

میں اس کا گوشت خون کی نجاست سے پوری طرح پاک ہو جاتا ہے۔

اس کا اصل طریقہ ذبح یا نحر ہے۔ ذبح گائے، بکری اور اس کے مانند جانوروں کے لیے خاص ہے اور نحر اونٹ اور اس کے مانند جانوروں کے لیے۔ ذبح سے مراد یہ ہے کہ کسی تیز چیز سے حلقوم اور مری (غذا کی نالی) یا حلقوم اور ودجین (گردن کی رگوں) کو کاٹ دیا جائے اور نحر یہ ہے کہ جانور کے حلقوم میں نیزے جیسی کوئی تیز چیز اس طرح چبھوئی جائے کہ اس سے خون کا فوارہ چھوٹے اور خون بہ بہ کر جانور بالآخر بے دم ہو کر گر جائے۔

اس طریقے پر عمل کرنا اگر کسی وقت ممکن نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ کسی بھی چیز سے اس طرح کا زخم لگا دینا اس صورت میں کافی ہے جس سے سارا خون بہ جائے:

عن عدی بن حاتم رضی الله عنه، قال: یا رسول الله، أرأیت احدنا اصاب صیداً ولیس معه سکین، أیذبح بالمروة وشقة العصا؟ فقال امرر الدم بما شئت واذکر اسم الله عزوجل. (ابوداؤد، کتاب الضحایا)

”عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، آپ فرمائیں کہ ہم میں سے کوئی اگر اپنا شکار پالے اور اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا وہ پتھر یا لکڑی کے ٹکڑے سے ذبح کر لے؟ آپ نے فرمایا: جس چیز سے چاہو، خون بہادو اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لو۔“

تیر اور بندوق سے شکار کے جواز اور عدمِ جواز کا فیصلہ بھی اسی قاعدے کے مطابق کیا جائے گا۔ سدھایا ہوا جانور اگر شکار کو پھاڑ دے تو قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی ہے کہ اس کا حکم بھی یہی ہے۔ اس طرح کا شکار اگر زندہ نہ بھی ملے تو اسے 'میتة' نہیں سمجھنا چاہیے[7]۔ ارشاد فرمایا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ

”وہ پوچھتے ہیں: ان کے لیے کیا چیز حلال ٹھیرائی گئی ہے؟ کہہ دو، تمھارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور شکاری جانوروں میں سے جن کو تم نے اس علم میں سے کچھ سکھا کر سدھایا ہے جو اللہ نے تمھیں سکھایا،

۷۔ لیکن اگر پھاڑا نہ ہو اور جانور خوف سے مر جائے تو وہ پھر 'میتة' ہی ہے۔ اسی طرح پھاڑا نہ ہو اور وہ زندہ مل جائے تو اسے لازماً ذبح کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر تذکیہ کا تقاضا، بالبداہت واضح ہے کہ کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اللّٰهِ عَلَیۡهِ ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ. (المائدہ ۵: ۴)

(اُن کا شکار بھی)۔ لہٰذا اس میں سے کھاؤ جو وہ تمھارے لیے روک رکھیں، اور اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔''

مائدہ کی یہ آیت جس سیاق میں آئی ہے، اس سے واضح ہے کہ اس سے اوپر کی آیت میں درندے کے پھاڑے ہوئے جانور کو چونکہ صرف اس صورت میں جائز قرار دیا ہے جب اس کو زندہ حالت میں ذبح کر لیا جائے، اس لیے یہ سوال اس کے بارے میں پیدا ہوا کہ سدھایا ہوا جانور اگر شکار کو پھاڑ دے اور شکار ذبح کی نوبت آنے سے پہلے ہی دم توڑ دے تو اس کا حکم کیا ہو گا۔ اس سوال کا جواب اس آیت میں یہ دیا گیا ہے کہ اس طرح کے جانور کا اسے پھاڑنا ہی اس کا تذکیہ ہے، لہٰذا اسے ذبح کیے بغیر کھایا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اسے اپنے مالک کے لیے روک رکھے۔ اس میں سے اس نے اگر کچھ کھا لیا ہے تو اس کا کیا ہوا شکار جائز نہ رہے گا۔ آیت میں یہ شرط 'مما امسکن علیکم' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اس معاملے میں درندے اور پرندے کے شکار کے درمیان فرق کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اس حد تک تربیت جس طرح درندے قبول کر لیتے ہیں، باز، عقاب اور شاہین بھی قبول کر لیتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا یہ مدعا اس طرح واضح فرمایا ہے:

اذا ارسلت کلبک فاذکر اسم اللّٰه علیه، فان ادرکته لم یقتل فاذبح واذکر اسم اللّٰه علیه، وان ادرکته قد قتل ولم یأکل، فقد امسکه علیک، فان وجدته قد اکل منه، فلا تطعم منه شئیا فانما امسک علی نفسه، وان خالط کلبک کلابا فقتلن، فلم یأکلن، فلا تأکل منه شئیا فانک لاتدری ایهما قتل.

''تم جب اپنا کتا چھوڑتے ہو تو اللہ کا نام لے کر چھوڑو۔ پھر اگر دیکھو کہ اس نے شکار کو مارا نہیں تو اللہ کا نام لے کر ذبح کر لو اور اگر دیکھو کہ مار ڈالا ہے، مگر اس میں سے کچھ کھایا نہیں تو تم اسے کھا سکتے ہو، اس لیے کہ یہ اس نے تمھارے لیے روک رکھا ہے، لیکن اگر کھا لیا ہو تو اسے کھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ پر اس نے اپنے لیے روکا ہے۔ اور اگر دوسرے کتے بھی اپنے کتے کے ساتھ اس طرح دیکھو کہ انھوں نے شکار کو

(النسائی، کتاب الصید والذبائح)

مار دیا ہے تو نہ کھاؤ، اس لیے کہ تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کس نے مارا ہے۔"

آیت میں 'میتة' کے بعد دوسری اور تیسری چیز بہایا ہوا خون اور سؤر کا گوشت ہے۔ ان میں سے سؤر کے گوشت کا معاملہ تو کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ بہائے ہوئے خون کی حرمت کے بارے میں یہ بات البتہ واضح رہنی چاہیے کہ اس کے لیے 'دماً مسفوحاً' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، ان کا مفہوم وہی ہے جو عام بول چال میں ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔ تلی اور جگر کے متعلق یہ بات اگرچہ کہی جاسکتی ہے کہ یہ بھی در حقیقت خون ہی ہیں، لیکن جس طرح کہ زمخشری کے حوالے سے اوپر ہم نے بیان کیا ہے، عرفِ استعمال کا تقاضا ہے کہ ان پر اس کا اطلاق نہ کیا جائے۔ اسی طرح 'مسفوحاً' کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ رگوں اور شریانوں میں رکا ہوا خون بھی حرمت کے اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے بعد چوتھی اور آخری چیز غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ ہے۔ قرآن نے سورۂ انعام کی زیرِ بحث آیت میں واضح کر دیا ہے کہ اس کی حرمت کا باعث خود جانور کا 'رجس' یعنی ظاہری نجاست نہیں، بلکہ ذبح کرنے والے کا 'فسق' ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا چونکہ ایک مشرکانہ فعل ہے، اس لیے اسے 'فسق' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ علم و عقیدہ کی نجاست ہے۔ اس طرح کی نجاست جس چیز کو بھی لاحق ہو جائے، عقل کا تقاضا ہے کہ اس کا حکم یہی سمجھا جائے۔ قرآن نے سورۂ مائدہ میں بعض چیزیں اسی اصول کے تحت ممنوع قرار دی ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِكُمۡ فِسۡقٌ.(۵:۳)

"اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو کسی آستانے پر ذبح کیے گئے ہوں اور وہ بھی جن کا گوشت جوئے میں جیتا جائے۔ یہ سب باتیں فسق ہیں۔"

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"'وما ذبح علی النصب'، 'نصب' تھان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے تھان اور استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں، جنوں کی خوش نودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن نے اس قسم کے ذبیحے بھی حرام قرار دیے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ ان کے اندر حرمت مجرد بارادۂ تقرب و خوش نودی استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ان پر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نام اللہ کا لیا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا۔ اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب سے ان کو حرمت لاحق ہوتی تو ان کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اوپر 'وما اهل لغير الله به' کا ذکر گزر چکا ہے، وہ کافی تھا۔ ہمارے نزدیک اسی حکم میں وہ قربانیاں بھی داخل ہیں جو مزاروں اور قبروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحبِ مزار اور صاحبِ قبر کی خوش نودی مدِ نظر ہوتی ہے۔ ذبح کے وقت نام چاہے اللہ کا لیا جائے یا صاحبِ قبر و مزار کا، ان کی حرمت میں دخل نام کو نہیں، بلکہ مقام کو حاصل ہے۔

'وان تستقسموا بالازلام' 'استقسام' کے معنی ہیں حصہ یا قسمت یا تقدیر معلوم کرنا۔ 'ازلام' جوئے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن سے وہ اپنے زعم کے مطابق غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے تھے۔ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں 'خمر و میسر' کے تحت بیان کر آئے ہیں کہ عرب شراب نوشی کی مجلسیں منعقد کرتے، شراب کے نشے میں جس کا اونٹ چاہتے، ذبح کر دیتے، مالک کو منہ مانگے دام دے کر راضی کر لیتے، پھر اس کے گوشت پر جوا کھیلتے۔ گوشت کی جو ڈھیریاں جیتتے جاتے، ان کو بھونتے، کھاتے، کھلاتے اور شرابیں پیتے اور بسا اوقات اسی شغلِ بد مستی میں ایسے ایسے جھگڑے کھڑے کر لیتے کہ قبیلے کے قبیلے برسوں کے لیے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے اور سیکڑوں جانیں اس کی نذر ہو جاتیں —— مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہاں 'استقسام بالازلام' سے یہی دوسری صورت مراد ہے۔"

(تدبرِ قرآن ج ۲ ص ۴۵۶-۴۵۷)

وہ ذبیحہ جس پر غیر اللہ کا نام تو نہیں لیا گیا، لیکن اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا، وہ بھی اسی کے تحت ہے۔ قرآنِ مجید میں اس کو اسی طرح 'فسق' قرار دیا گیا ہے، جس طرح 'ما اهل لغير الله به' کو قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں جانوروں سے متعلق اہلِ عرب کے بعض توہمات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ. (۶:۱۲۱)

"اور تم اس جانور کو نہ کھاؤ جسے اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، بے شک، یہ فسق ہے۔ اور یہ شیاطین اپنے ساتھیوں کو القا کر رہے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں۔ اور (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) تم نے اگر ان کا کہا مانا تو تم بھی مشرک ہو

جاؤ گے۔''

ذبیحہ اور صید پر یہ اللہ کا نام نہ لینا، ایسا فسق کیوں ہے کہ اس کے نتیجے میں جانور 'ما اھل لغیر اللّٰہ بہ' کے حکم میں داخل ہو جائے؟ استاذ امام اس کے وجوہ بیان کرتے ہوئی لکھتے ہیں:

''اول یہ کہ اللہ کے نام اور اس کی تکبیر کے بغیر جو کام بھی کیا جاتا ہے وہ، جیسا کہ ہم آیت بسم اللہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، برکت سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی ہر نعمت سے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، فائدہ اٹھاتے وقت ضروری ہے کہ اس پر اس کا نام لیا جائے تاکہ بندوں کی طرف سے اس کے انعام و احسان کا اعتراف و اقرار ہو۔ اس اعتراف و اقرار کے بغیر کوئی شخص کسی چیز پر تصرف کرتا ہے تو اس کا یہ تصرف غاصبانہ ہے اور غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا، بلکہ یہ جسارت اور ڈھٹائی ہے جو خدا کے ہاں مستوجبِ سزا ہے۔

دوم یہ کہ احترامِ جان کا یہ تقاضا ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ جان کسی کی بھی ہو، ایک محترم شے ہے۔ اگر خدا نے ہم کو اجازت نہ دی ہوتی تو ہمارے لیے کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہ ہوتا۔ یہ حق ہم کو صرف خدا کے اذن سے حاصل ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم ان میں سے کسی کی جان لیں، صرف خدا کے نام پر لیں۔ اگر ان پر خدا کا نام نہ لیں یا خدا کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لیں یا کسی غیر اللہ کے نام پر ان کو ذبح کر دیں تو یہ ان کی جان کی بھی بے حرمتی ہے اور ساتھ ہی جان کے خالق کی بھی۔

سوم یہ کہ اس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی، ان کی نذر اور ان کے چڑھاوے کو ابتدائے تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیاز مندی میں مبتلا ہوئی، اس نے مختلف شکلوں سے اس غیر اللہ کو راضی کرنے کے لیے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسانوں کو گمراہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے، اس میں بھی، جیسا کہ ہم اس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس ذریعۂ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام نے شرک کے ان تمام راستوں کو بند کر دینے کے لیے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اس کو کھولنے یا اس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا، وہ جانور بھی حرام۔'' (تدبر قرآن ج ۳ ص ۱۵۷-۱۵۸)

یہی معاملہ اس ذبیحہ اور صید کا بھی ہے جس پر اللہ کا نام تو لیا گیا، لیکن نام لینے والا اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتا یا مانتا تو ہے، مگر خداؤں کی انجمن میں ایک رب الارباب کی حیثیت سے مانتا ہے اور شرک ہی کو اصلاً اپنا دین قرار دیتا ہے۔ ذبح کرتے وقت شرک کے ارتکاب اور مشرک کے ذبیحہ میں، ظاہر ہے کہ کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ مجید نے اسی بنا پر مسلمانوں کے علاوہ صرف اہلِ کتاب کا ذبیحہ جائز قرار دیا ہے، اس لیے کہ وہ اصلاً توحید ہی کے ماننے والے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ ۪ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ. (المائدہ ۵:۵)

''اب تمھارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہل کتاب کا کھانا بھی تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے۔''

ان محرمات سے استثنا صرف حالتِ اضطرار کا ہے، اور وہ بھی 'غیر باغ ولا عاد' یعنی اس طرح کہ آدمی نہ خواہش مند ہو نہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھنے والا ہو۔ بقرہ و نحل کی آیات میں بھی یہ بات بالکل انھی الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ مائدہ میں البتہ، الفاظ کا معمولی فرق ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. (۵:۳)

''پھر جو بھوک سے مجبور ہو کر کوئی حرام چیز کھا لے، بغیر اس کے کہ وہ گناہ کی طرف مائل ہو تو اللہ بخشنے والا ہے، وہ سراسر رحمت ہے۔''

استاذ امام اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

'''مخمصۃ' کے معنی بھوک کے ہیں۔ بھوک سے مضطر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی بھوک کی ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے کہ موت یا حرام میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راہ بظاہر کھلی ہوئی باقی ہی نہ رہ جائے۔ ایسی حالت میں اس کو اجازت ہے کہ حرام چیزوں میں سے بھی کسی چیز سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ 'غیر متجانف' کی قید اسی مضمون کو ظاہر کر رہی ہے جو دوسرے مقام میں 'غیر باغ ولا عاد' سے ادا ہوا ہے۔ یعنی نہ تو دل سے چاہنے والا بنے اور نہ سدرِ مق کی حد سے آگے بڑھنے والا۔ 'مخمصۃ' کی قید سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جہاں دوسرے غذائی بدل موجود ہوں، وہاں مجرد اس عذر پر کہ شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں آتا، جیسا کہ یورپ اور امریکا کے اکثر ملکوں کا حال ہے،

ناجائز کو جائز بنا لینے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ گوشت زندگی کے بقا کے لیے ناگزیر نہیں ہے۔ دوسری غذاؤں سے نہ صرف زندگی، بلکہ صحت بھی نہایت اعلیٰ معیار پر قائم رکھی جا سکتی ہے، 'غیر متجانف لاثم' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ رخصت بہر حال رخصت ہے اور حرام بہر شکل حرام ہے۔ نہ کوئی حرام چیز شیرِ مادر بن سکتی، نہ رخصت کوئی ابدی پروانہ ہے۔ اس وجہ سے یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دفعِ اضطرار کی حد سے آگے بڑھے۔ اگر ان پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی شخص کسی حرام سے اپنی زندگی بچا لے گا تو اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اگر اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنے حظِ نفس کی راہیں کھولے گا تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے یہ اجازت اس کے لیے قیامت کے دن عذر خواہ نہیں بنے گی۔''

(تدبرِ قرآن ج ۲ ص ۴۵۸-۴۵۹)

یہ سب چیزیں، جس طرح کہ قرآن کی ان آیات سے واضح ہے، صرف خورونوش کے لیے حرام ہیں۔ رہے ان کے دوسرے استعمالات تو وہ بالکل جائز ہیں۔ کسی صاحبِ ایمان کو اس معاملے میں ہرگز کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق یہ بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے:

قال: تصدق علی مولاۃ لمیمونۃ بشاۃ فماتت، فمربھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال: ھلا اخذتم اھابھا فدبغتموہ فانتفعتم بہ؟ فقالوا: انھا میتۃ، فقال: انما حرم اکلھا.(مسلم، کتاب الحیض)

''سیدہ میمونہ کی ایک لونڈی کو بکری صدقے میں دی گئی تھی۔ وہ مر گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا: تم نے اس کی کھال کیوں نہیں اتاری کہ دباغت کے بعد اس سے فائدہ اٹھاتے؟ لوگوں نے عرض کیا: یہ تو مردار ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کا صرف کھانا ہی حرام ہے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مکاتیب

[مدیرِ ''اشراق'' کے نام آنے
والے خطوط اوران کے جوابات]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۲۲کتوبر ۱۹۸۵

محترم المقام جناب غامدی صاحب زید علوکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ بہمہ وجوہ بخیر وعافیت ہوں۔ ''اشراق'' اکتوبر ۱۹۸۵ موصول ہو کر باعث تشکر وامتنان ہوا۔ اگرچہ جناب نے یہ شمارہ اعزازی طور پر ہی ارسال فرمایا ہے تاہم میں چونکہ بلاوجہ جناب پر مالی بار ڈالنا نہیں چاہتا اس لیے مبلغ ۲۸۰ (قیمت رسالہ مع محصول ڈاک) اس درخواست کے ساتھ ارسال خدمت کر رہا ہوں کہ جناب قبول فرمائیں۔

ماشاءاللہ جس علمی انداز میں آپ نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بعض مزعومات کی تغلیط وتردید فرمائی ہے، وہ قابلِ تحسین ہے اور اس میں ہر اس مسلمان کے لیے پوری رہنمائی ہے جو کسی غیر شرعی مسلم حکومت کو حکومتِ الٰہیہ میں تبدیل کرنے کا انفرادی یا جماعتی طور سے خواہش مند ہو۔ نیز احقر کا خیال ہے کہ اگر جماعتِ اسلامی اس مضمون کو ٹھنڈے دل سے پڑھے تو اس کو مولانا مودودی رحمہ اللہ کی بعض غلطیوں کا علم ہو جائے اور وہ اپنے طریق کار میں مناسب ترمیم کر لیں اور ساتھ وہ حضرات بھی اپنے خیال کی اصلاح کر لیں جو مولانا کو مجدد یا مجدد اعظم سمجھتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ دورِ صحابہ کے بعد کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اسلام کو مولانا مودودی کی طرح ٹھیک سمجھا ہو۔

رسالہ کے مندرجات میں سے کسی چیز کو مبنی بر صواب نہ پانے پر جناب کو اس سے مطلع کرنے کی اجازت (صفحہ ۴۲ کے مطابق) اگرچہ اہلِ علم کے ساتھ مخصوص فرما دی گئی ہے، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم اُن مسائل میں جن میں اہلِ علم خود متفق نہیں بوجہ اس کے کہ ان کا منصوص ہونا واضح نہیں، ہم جیسے عامیوں کو بھی کچھ سوچنے سمجھنے کا حق ہے، لہٰذا جسارت کی معافی چاہتے ہوئے مندرجہ ذیل باتوں پر کماحقہٗ غور کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔

۱۔ غلبۂ دین کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ امت کے اندر ایک راشدہ خلافت کے قیام کا وجوب بتلایا گیا ہے، میں کہتا ہوں کہ حکومت کا شرعی یا راشدہ ہونا تو بعد کی بات ہے، نفسِ حکومت کے قیام کا ہی کوئی واضح وجوبی حکم قرآن میں نہیں ہے، جو میرے نزدیک قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ بات یہ ہے کہ حکومت کا قیام بڑی حد تک غیر اختیاری ہے، اس کے لیے ساز گار حالات کی ضرورت ہے، پس اس کا مکلف بنانا تکلیف مالا یطاق ہوتا۔ سورۂ آلِ عمران آیت ۱۰۴ سے عربیت کے قاعدہ سے آپ نے یہ استنباط فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے میں سے ایک جماعت دعوت و تبلیغ کے لیے سیاسی اقتدار کی حامل مقرر کرنا چاہیے۔ سو اول تو یہ مطلب ہی محلِ کلام ہے کیونکہ حضرت مولانا تھانوی حکیم الامت نے، جو مفسرین میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں 'یامرون بالمعروف' کا تفسیری ترجمہ بجائے ''معروف کا حکم کرے'' کے ''نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں'' کیا ہے۔ بخیال احقر 'خیر' سے مراد یہاں اسلام لیا جا سکتا ہے اور 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' اسی کی ایک حد تک تفصیل ہے۔ اگر آپ کے خیال سے یہ جماعت سیاسی اقتدار کی حامل ہو تو وہ معروفات کی ترویج اور منکرات کا انسداد تو بے شک بزور کر سکے گی، لیکن دعوت اِلی الاسلام میں ہر گز اپنے اقتدار کو کام میں نہیں لا سکتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ عطف صحیح نہ رہے گا۔ درحقیقت یہ عطف ایسا ہی ہے جیسے 'امنوا' اور 'عملوا الصٰلحت' کے درمیان ہوتا ہے، یعنی 'عملوا الصٰلحت... امنوا' ہی کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے اور اس کی نوعیت بعینہٖ وہی ہے جو عطف خاص علی العام کی ہے۔ (قولِ فراہی صفحہ ۴۶ رسالہ ہٰذا)۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ تاریخ سے کسی دور میں ایسی جماعت کے وجود کا پتا نہیں چلتا جو سیاسی اقتدار کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام کرتی رہی ہو۔ نیز یہ بھی غور طلب ہے کہ اگر یہ جماعت سیاسی اقتدار رکھنے والی مراد ہوتی تو آیت کے آخر میں 'واولئک ھم المفلحون' نہ لایا جاتا کیونکہ اس صورت میں دعوت و تبلیغ کوئی دشوار اور ہمت کا کام نہ رہتا جس کے لیے اللہ تعالیٰ اس کو خاص طور سے مستحقِ فلاح قرار دیں۔ ان تمام دلائل سے قطعِ نظر اگر آپ کا

نکالا ہوا مطلب ہی صحیح مان لیا جائے تب بھی چونکہ یہ آیت قیامِ حکومتِ شرعیہ کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو گا کہ شرعی حکومت کو ایک سیاسی اقتدار کی حامل جماعت دعوت و تبلیغ کے لیے مقرر کرنا چاہیے، قیامِ حکومت یا حکومتِ شرعیہ کا وجوب ثابت نہ ہو گا، کیونکہ دعوت و تبلیغ ایسا کام نہیں جو بلا سیاسی اقتدار کے ہو ہی نہ سکے۔ تاہم انبیا علیہم السلام، بلکہ اکثر مبلغین نے یہ کام ہمیشہ بلا اقتدار ہی کیا ہے۔ خود قرآن میں دوسرے مقامات پر مثلاً سورۂ توبہ آیت ۱۱۲ اور سورۂ لقمان آیت ۱۷ میں 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا ذکر ہے جہاں اقتدار کا شائبہ بھی نہیں، البتہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے کسی ایسے حکم کی آیت پیش کرتے، جس کی تعمیل بلا اقتدار کے ہو ہی نہ سکے تو حکومتِ راشدہ کا وجوب ثابت ہو جاتا جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ''ازالتہ الخفاء'' میں کیا ہے۔ خلافت کی تعریف وہ اس طرح فرماتے ہیں:

> ''خلافت عبارت ہے اقامتِ دین کے لیے اقتدارِ اعلیٰ سے، اس طرح کہ دینی علوم کو زندہ کیا جائے، ارکانِ اسلام کو قائم کیا جائے۔ جہاد اور اس سے متعلق امور (یعنی فوجوں کی تنظیم اور مجاہدین کی بھرتی اور ان پر مالِ غنیمت کی تقسیم) کے انتظامات کئے جائیں، نظامِ قضا اور حدود جاری کئے جائیں مظالم کا قلع قمع کیا جائے اور 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' کا قیام عمل میں آئے۔ اور یہ سب کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کے طور پر انجام دیا جائے..... اس کا انتظام قیامت تک کے لیے مسلمانوں کے ذمہ واجب بالکفایہ ہے۔''

پھر وہ اس کے شرعی دلائل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے جہاد و قضا، احیاے علوم دین، اقامتِ ارکانِ اسلام کفار کے تسلط سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کو فرض بالکفایہ قرار دیا ہے۔ اور یہ سب ''امام'' کے تقرر وانتخاب کے بغیر صورت پذیر نہیں ہو سکتا اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے (یعنی اگر کوئی واجب کسی عمل کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتا تو وہ عمل بھی واجب ہو گا)۔''

لیکن واضح رہے کہ یہ وجوب بالکفایہ بھی صرف ان مسلمانوں پر ہے جو کسی خطۂ ارض میں آزاد ہوں جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے۔

۲۔ غلبۂ دین کی جدوجہد کا دوسرا مرحلہ آپ کے نزدیک دنیا بھر کی قوموں پر اس کے سیاسی غلبہ کا ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی زمامِ اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اپنے اسی دعوے کے ثبوت میں آپ نے سورۂ توبہ کی آیت ۲۹ پیش فرمائی ہے جو قطعاً ناکافی ہے کیونکہ اس کی رو سے صرف اہلِ کتاب کو جزیرہ نماے عرب میں جزیہ دے کر زندہ رہنے کا حق دیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے کفار و مشرکین کے ساتھ حضرت امام اعظم

رحمہ اللہ کے نزدیک یہ رعایت نہ تھی۔ بلکہ ان کے لیے اسلام تھا یا سیف، یعنی اگر مسلمان نہ ہوں تو قتل کر دیے جائیں، کیونکہ کفارِ عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا۔ ابنِ شہاب کے قول سے بھی (جو درمنشور میں منقول ہے) امامِ اعظم کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کہ کفارِ قریش و عرب کے بارے میں تو یہ حکم نازل ہوا، 'قاتلوھم حتی لا تکون فتنہ' (الانفال: ۳۹) اور آیت 'حتی یعطوا الجزیۃ' اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس آیت کا تعلق بیرونِ عرب کسی غیر مسلم کی حکومت کو محض اسلام نہ لانے کی بنا پر ختم کرنے سے نہیں ہے البتہ، فتنہ و فساد برپا کرنے، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ و غیر مصلحانہ برتاؤ رکھنے کی بنا پر بیرونِ عرب بھی ان کی حکومتیں ختم کی جا سکتی ہیں۔ قرآن میں جہاں کہیں بھی مشرکین اور اہلِ کتاب سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے، ان سے مراد عموماً اہلِ عرب ہی ہوتے ہیں اور احقر کی نگاہ میں صرف ایک مقام (سورۂ فتح آیت ۱۶) ہی ایسا ہے جہاں ایران و شام کے کفار مراد ہیں، لیکن وہاں ایسا سمجھنے کا قرینہ پایا جاتا ہے۔ پھر آپ کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا منشا مسلمانوں کے ذریعے سے تمام روے زمین کی غیر مسلم حکومتوں کو ان کے غیر مسلم ہونے کی بنا پر ختم کرانا ہوتا تو اتنے ضروری اور مہتم بالشان حکم کو جس کا تعلق پوری امتِ مسلمہ سے ہو، وہ صاف صاف کیوں نہ فرماتے تاکہ استنباطی غلطیوں کا امکان نہ رہتا؟ احقر کے نزدیک تو یہ نظریہ قطعی غلط اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت مضر ہے۔ خصوصاً ہمارے زمانے میں۔ بلکہ یہ ایک المیہ ہے جو سب سے پہلے اخوان المسلمین کے بانی یا مولانا مودودی کے دماغ میں پیدا ہوا اور پھر اکثر مسلم ممالک میں پھیل گیا، حالانکہ یہ لوگ دنیا بھر میں تو حکومتِ الٰہیہ کیا قائم کرتے، خود اپنی حکومتوں میں بھی نہ کر سکے اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر مستقبل قریب میں بھی ایسا کر سکنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔

قرآنِ مجید سے غیر ثابت و غیر موید ہونے کے علاوہ یہ نظریہ عقلاً بھی غلط ہے۔ اول تو اس وجہ سے کہ جب غیر مسلم یہ سمجھ لیں گے کہ مذہبِ اسلام کی تعلیم ہی غیر مسلموں کے اقتدار کو دنیا سے مٹانا ہے تو وہ کبھی بھی اسلام کی دعوت و تبلیغ کو سنجیدگی سے نہ سنیں گے بلکہ اس سے نفرت کریں گے۔ بقول مولانا وحید الدین خاں یوں بھی مفتوح کے اندر فاتح کے لیے نفرت کے جذبات ہوتے ہیں، اس لیے مفتوح فریق ثانی کی کسی چیز کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتا، خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ دعوت و تبلیغ مسلمانوں کا خاص کام، بلکہ ان کی وجۂ تخلیق ہے۔ تو جو چیز اس کو بے اثر کر دے، اس کی قباحت کا کیا ٹھکانا! دوسرے غیر مسلم حکومتوں کی خواہش اور اس کے نتیجے میں کوشش متحد طور پر یہ ہو گی کہ مسلم حکومت کو اتنی طاقت ہی حاصل نہ ہو جو وہ ان پر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حملہ آور ہونے اور ان کو مٹانے کا خیال دل میں لائے، بلکہ 'قتل الموذی قبل الایذا' کے اصول پر ہر ممکن طریقہ پر وہ مسلمانوں کو کچلنے کی کوشش کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی یہ کوشش حق بجانب ہو گی۔

تیسرے یہ کہ آیت 'ما جعل علیکم فی الدین من حرج' (حج ۷۸) اور حدیث 'الدین یسر' دونوں موجبِ اشکال ہوں گی، کیونکہ جس دین میں زندگی بھر قتال میں مصروف رہنے کا حکم ہو (بایں وجہ کہ دنیا بھر میں اسلامی حکومت دو چار سال میں تو قائم ہو نہیں سکتی) اس کو تنگی سے خالی اور آسان ہر گز نہیں کہا جا سکتا۔ چوتھے اگر بالفرض محال کہیں طاقت کے بل پر غیر مسلم حکومت کو ختم کر کے اسلامی حکومت قائم بھی کر لی، لیکن وہاں کی اکثریت ایمان نہ لائی، کیونکہ مفتوح عموماً فاتحین کے اعلیٰ کردار سے متاثر ہو کر ایمان لایا کرتے ہیں۔ اور بدقسمتی سے وہ چیز مدت سے مسلمانوں کی اکثریت سے عنقا ہے۔ تو ایسی صورت میں سنگین کی نوک پر حکومت کرنے سے کیا فائدہ؟ اور وہ چلے گی کتنے دن؟ اور اس کے خاتمے پر غیر مسلموں کا جوردِ عمل ہو گا ظاہر ہے اسپین اور ہندوستان کی مثالیں سب کے سامنے ہیں۔ پس ہم نہیں سمجھتے کہ جو نظریہ اتنے مفاسد کا حامل ہو، خصوصاً جو کفار کو اسلام سے متنفر کرے، بلکہ اسلام اور مسلم دشمنی پر آمادہ کرے، وہ قرآن کی تعلیم ہو، کبھی ہو سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ بلکہ ہمارے نزدیک تو ایسا کہنے والے اسلام کو بدنام کرنے والے ہیں۔ دراصل ہم مسلمان اصلاً تو صرف دعوت و تبلیغِ اسلام حسبِ استعداد دنیا بھر میں کرنے ہی کے مکلف ہیں۔ اور اس کی راہ سے مخالفتوں اور مزاحمتوں کے بھی حتی الامکان دور کرنے کے (جس میں غیر مصالح غیر مسلم حکومتوں پر قبضہ کر لینا بھی شامل ہے) نہ یہ کہ دنیا بھر میں علی الاطلاق حکومتِ الٰہیہ قائم کرتے رہنے کے بھی۔ اور یہ احقر ہی کا خیال نہیں بلکہ مشاہیرِ اسلام بھی اس کے موید ہیں۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

> ''اسلام کا اصل مقصد دعوت و تبلیغ ہے، اب اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدِ راہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے اور نہ اس کے رعایا بنا لینے کی ضرورت ہے۔ صرف معاہدۂ صلح کافی ہے، جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں۔ لیکن جب کوئی قوم اسلام دشمنی پر کمربستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کی مدافعت کے لیے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے اور اس کو زیرِ اثر رکھنا پڑتا ہے۔ خیبر اس قاعدہ کے مطابق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک ہے۔'' (''مبلغِ اعظم'' ماخوذ از ''سیرت النبی'' از شیخ عبد الغفار اثر۔ اسلامی مشن سنت نگر۔ لاہور)

اسی قسم کا قول حکیم الاسلام قاری طیب صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کا ہے ملاحظہ ہو ''حکیم الاسلام اور ان کی مجالس'' (جلد اول ص ۲۳۷-۲۳۸) اور ابھی تقریباً ایک ماہ قبل مفتی رشید احمد لدھیانوی مدظلہ (دار الافتاء و الارشاد کراچی) نے میرے پیش کردہ نظریۂ بالا کی تصویب فرمائی ہے۔ حضرت مولانا تھانوی

حکیم الامت کے بعض ملفوظات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو کافر حکومت مسلمانوں کے ساتھ مصالحت سے رہنا نہ چاہے، اسی پر اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ جناب کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ سورۂ توبہ کی اسی آیت مذکورہ کے حکم کی پیروی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرب کے اہلِ کتاب اور ایران کی حکومتوں کے خلاف جہاد کیا۔ اہلِ کتاب میں یہود سے جو جنگیں ہوئیں وہ اس آیت کے نزول سے قبل ہو چکی تھیں اور ہرگز اس بنا پر نہیں ہوئیں، بلکہ ان کی عہد شکنی اور شرارت کی بنا پر ہوئیں، جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے سوائے خیبر کے اور کہیں باقاعدہ جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور جزیرہ نماے عرب میں نصرانیوں سے کوئی جنگ نہیں ہوئی، بلکہ انھوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا تھا۔ رہا ایران و روم کا سوال تو تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ دونوں ملک اہلِ عرب سے مذہبی اور سیاسی بنا پر دشمنی رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ان سے طویل جنگیں ہوئیں اور ان ممالک پر قبضہ کر لیا گیا نہ کہ ان کے غیر مسلم ہونے کی بنا پر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشین گوئی فرمایا تھا کہ جب تک شام و ایران پر قبضہ نہ کرو گے، تم مسلمانوں کو اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہو گا۔ ایران و شام فتح ہو جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مزید فتوحات کرنا نہیں چاہتے تھے، لیکن حضرت عمرو بن العاص نے لگے ہاتھ مصر پر بھی قبضہ کر لینے کی درخواست پیش کی تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منظور فرمائی تھی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمانوں نے دیگر غیر مسلم حکومتوں کے شر سے محفوظ رہنے ہی کے واسطے ان پر حملہ کیا ہے۔ نہیں انھوں نے چند چھوٹے چھوٹے ممالک مثلاً آذر بائجان اور شمالی افریقہ پر بھی جہاد کیا ہے جس کی مختلف وجوہ ہیں جن میں سے سب سے بڑی وجہ دعوت و تبلیغِ اسلام ہے جس کا اس زمانہ میں بہترین طریقہ یہی تھا نہ کہ روے زمین سے غیر مسلم اقتدار کو مٹانا اور واضح رہے کہ اس زمانہ میں کیا، اب سے ایک ڈیڑھ صدی قبل تک دنیا میں فتوحات کا عام رواج تھا۔ ہر طاقت ور حکومت کمزور حکومتوں کو باج گذار بنانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اور یہ چیز بادشاہوں کے لیے معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ ان کے محاسن میں شمار ہوتی تھی۔ ایسی ہی فتوحات کی وجہ سے سکندر، سکندرِ اعظم کہلایا۔ اسی طرح سے اکبر اعظم، پیٹر اعظم وغیرہ کو سمجھیے۔ اس وقت اگر مسلمانوں نے بھی اس رواج سے فائدہ اٹھا کر اعلاے کلمۃ اللہ (دعوت و تبلیغ کی حد تک) کے لیے چند ممالک پر قبضہ کر لیا تو ان پر اعتراض کا کیا موقع ہے جبکہ دوسرے لوگ محض طاقت کے مظاہرے اور حصولِ مال و جاہ کے لیے ایسا کرتے تھے۔ اب چونکہ بین الاقوامی طور پر توسیع پسندی کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس لیے

بین الاقوامی رواج کا احترام مسلمانوں پر بھی لازم ہے۔ پھر اب تبلیغ کے لیے کسی ملک پر قبضہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی، سوائے کمیونسٹ ممالک کے ہر ملک میں تبلیغِ اسلام کی عام اجازت ہے جس سے مسلمانوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہاں، اگر طاقت ہو تو ان ملکوں پر جہاد کریں جو تبلیغ و دعوت کی اپنے ہاں اجازت نہیں دیتے۔

مجھے یہ تین ہی باتیں خاص طور پر عرض کرنا تھیں جن میں بھی دوسری یعنی غیر مسلم حکومتوں کو مٹانے والا نظریہ بہت اہم ہے اور احقر جناب سے اس پر خصوصی غور و توجہ کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ ان کے علاوہ چند معمولی باتیں یہ بھی ہیں:

۱۔ آیت 'هو الذی ارسل رسوله' میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کے نزدیک غلبہ سے مراد فکری غلبہ ہے نہ کہ اسلام کے تمام قوانین کا نفاذ (الرسالہ ستمبر ۱۹۸۳) اور احقر کے نزدیک فکری غلبہ اور اس کے نتیجہ میں عددی غلبہ یعنی لوگوں کا اسلام کی اصولی برتری سے متاثر ہو کر بکثرت اسلام قبول کرنا اور شدہ شدہ یہی دنیا کی اکثریت کا مذہب بن جانا مراد ہے، کیونکہ سیاسی غلبہ بلا اس قسم کے دینی غلبہ کے بیکارِ محض ہے اور دینی غلبہ کا طریقہ موثر دعوت و تبلیغ اور اس کی راہ سے مزاحمتوں کو دور کرنا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب دینی غلبہ کے لیے جد و جہد کریں تو اس آیت سے استدل کچھ غلط نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ وہی کام کریں گے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ اور 'علی الدین کله' کا مطلب صرف ادیانِ عرب پر غلبہ نہیں، بلکہ ادیانِ عالم مراد ہے۔ مگر چونکہ آپ غلبہ کا مطلب یہاں بھی سیاسی غلبہ لیتے ہیں اس لیے آپ کو صحیح مطلب میں کتر بیونت کرنی پڑی۔

۲۔ آیت ۷: ۲۹ (صفحہ ۱۸) کا ترجمہ صحیح مفہوم کا حامل نہیں۔ 'عند کل مسجد' کا مطلب یہاں ''ہر عبادت کے وقت'' ہے۔

۳۔ آیت ۴۸: ۱۶ (صفحہ ۱۲) کا مطلب غلط ہے۔ یہاں بنی اسماعیل مراد نہیں، بلکہ اشارہ روم و ایران والوں کی طرف ہے جیسا کہ حضرت حکیم الامت نے ''بیان القرآن'' میں لکھا ہے اور عقلاً بھی وہی صحیح ہے۔ دیکھیے تفسیر ''بیان القرآن''۔

۴۔ صفحہ ۳۹ آخری پیرا گراف۔ ہر سربراہِ مملکت اپنی رائے اکثریت کے خلاف رکھنے اور اسے نافذ کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہی اختیار رکھتا ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے بعد جب اس کثرت رائے کا فیصلہ ماننا ہوتا تو یہ سلطنت جمہوری ہو گی نہ کہ شخصی اور اسلام شخصی سلطنت کا موید ہے جیسا کہ حضرت حکیم الامت کے وعظ قطع التمنی میں بدلیل ثابت کیا گیا ہے۔

۵۔ تعجب ہے کہ آپ فراہی صاحب کو ''امام'' لکھتے ہیں، حالانکہ انھوں نے سورۂ فیل کی تفسیر میں لکھا ہے

کہ اصحابِ فیل کو اہلِ مکہ نے مارا اور چڑیاں ان کی لاشیں کھانے آئی تھیں۔ دیکھیے تفسیر ''تفہیم القرآن''۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآنِ مجید کی عبارت بعض جگہ فصاحت سے گر گئی ہے جس پر حضرت تھانوی نے ان پر کفر کا فتویٰ دیا تھا جو بعد میں مولانا عبد الماجد دریا بادی کی تاویلی سفارش سے واپس لے لیا تھا۔ دیکھیے ''حکیم الامت، نقوش و تاثرات'' از مولانا عبد الماجد دریا بادی۔ کیا اس قسم کی غلط باتیں کرنے کے بعد بھی کوئی شخص ''امام'' کہلانے کا مستحق ہے؟

۶۔ آیت ۵۸: ۲۰، ۲۱ (صفحہ ۱۱) سیاسی غلبہ (بایں معنی) کہ کسی رسول یا نبی کو اپنی قوم پر سلطانی اختیارات حاصل ہو جائیں (سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا) یعنی کوئی نبی یا رسول اپنی قوم پر جہاد کے ذریعے سے سوائے حضور کے غالب نہیں ہوا۔ اس لیے آیت میں غلبہ سے مراد سیاسی غلبہ لینا صحیح نہیں بلکہ غلبہ بالحجتہ والعواقب مراد ہے۔ دیکھیے تفسیر ''بیان القرآن''۔

آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ دنیا بھر سے غیر مسلموں کا اقتدار ہٹانے والے نظریہ کو قرآن کی طرف منسوب کرنا میرے نزدیک قرآن پر تہمت لگانا ہے۔ خدا کرے کہ اس غلط نظریہ کی قباحت مسلمانوں کی سمجھ میں آجائے تاکہ ان کی زبان یا قلم سے کبھی ایسی بات نہ نکلے۔ اور خدا کرے کہ آپ نے جو کچھ اس کی موافقت میں لکھا ہے اس سے آپ رجوع فرمالیں۔ غلطی کا اعتراف کر لینا ایک عملِ صالحہ اور عزیمت ہے۔ 'وما علی الا البلاغ'۔

نیاز مند

احقر کریم الدین عفی عنہ

(جدہ سعودی عرب)

انومبر ۱۹۸۵

محترم و مکرم جناب کریم الدین صاحب

السلام علیکم

عنایت نامہ ملا آپ کے اعتراضات کا مفصل جواب ان شاءاللہ ''اشراق'' کی کسی آیندہ اشاعت میں دوں گا۔

چند مختصر نکات پیشِ خدمت ہیں۔ امید ہے آپ غور فرمائیں گے۔

۱۔ آلِ عمران آیت ۱۰۴ میں 'امر' کو 'یدعون الی الخیر' پر عطف کی وجہ سے 'تلقین و ترغیب' کے معنی میں لینا عربیت کے خلاف ہے۔ یہ بے شک عطف الخاص علی العام ہے، لیکن اس کے معنی یہاں حکم کرنے ہی کے ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں حکومت داعی الی الخیر بھی ہوتی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی۔ کسی حکومت میں اگر یہ صفات نہ ہوں تو وہ لفظ کے کسی مفہوم میں اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

۲۔ توبہ آیت ۲۹ میں اہلِ کتاب کی عرب کے ساتھ تخصیص کا کوئی قرینہ آیت میں موجود نہیں ہے۔ یہ صرف میری ہی نہیں، تمام اکابر مفسرین کی رائے ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابنِ کثیر (آیت ۲۹، آیت ۱۲۳)۔

۳۔ صف آیت ۹ کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کے دلائل میں نے اپنے مضمون میں بیان کر دیے ہیں۔ میرے نزدیک آیت میں 'یظھرہ' کو فکری غلبہ کے معنی میں لینے کی کوئی گنجایش قرآنِ مجید کے الفاظ میں نہیں ہے۔ 'لو کرہ المشرکون' پر عطف کی وجہ سے اسے سرزمینِ عرب ہی کے ساتھ خاص ماننا ناگزیر ہے۔

۴۔ فتح آیت ۱۶ بنی اسماعیل ہی کے بارے میں ہے۔ روم و ایران کے لیے اسلام یا تلوار کا معاملہ نہیں تھا۔

۵۔ میں مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کو ان کے غیر معمولی علم، ان کے بے نظیر تقویٰ اور ان کی بے مثال تحقیقات کی بنا پر امام مانتا ہوں۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے لیے میرے دل میں بے حد احترام ہے، لیکن جس ہستی کا براہِ راست مطالعہ کر کے میں نے ایک رائے قائم کی ہے، اسے محض اس لیے تبدیل نہیں کر سکتا کہ انھوں نے اس کی تکفیر کی تھی۔ سورۂ فیل کی تفسیر میں مجھے ان کی رائے سے اتفاق ہے۔ قرآنِ مجید کی زبان کے بارے میں جو کچھ ان کی طرف منسوب کیا گیا تھا، اس کی تردید خود آپ کے بقول مولانا دریابادی نے کر دی تھی۔ میں نے اصل عبارت دیکھی ہے، اس میں بالکل دوسری بات کہی گئی ہے۔

والسلام

—— جاوید احمد

---

۱۳ نومبر ۱۹۸۵

محترم جناب مولانا جاوید احمد صاحب

السلام علیکم

مزاج شریف!

پچھلے دنوں کراچی جانا ہوا تو وہاں مولانا محمد طاسین صاحب نے آپ کا ذکرِ خیر کیا اور ''اشراق'' کا وہ شمارہ دیا جس میں آپ نے قرآن، عربی لغت اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے غلبۂ دین اور اس سے متعلق امور پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مجھے آپ کا یہ مضمون اتنا پسند آیا کہ میں مولانا طاسین صاحب کو وہ شمارہ واپس کرنے کے بجائے اپنے ہمراہ حیدر آباد لے آیا۔ کئی دوستوں کو میں نے یہ مضمون دکھایا ہے۔

اصل میں اس دور کا ایک المیہ یہ ہے کہ جدید نظریات، جدید نظاموں اور علوم و فنون کے غلبہ اور سامراج کے تسلط کی وجہ سے اسلامی مفکروں اور دانش وروں پر دین کے اجتماعی، سیاسی اور خارجی پہلو کا غلبہ ہو گیا اور انھوں نے اجتماعیت اور نظامِ زندگی اور حکومتِ الٰہیہ اور خارجی زندگی میں اقامتِ دین کو پیشِ نظر رکھ کر ہی پورے اسلام کی تشریح کر ڈالی۔

انفرادی اصلاح، تزکیۂ نفس، معاشرے کی اصلاح اور تربیتی اداروں کے استحکام اور علمی و فکری کام کی بنیادیں مستحکم کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے کے اندر برائی کے خلاف مدافعت کی قوت ہی پیدا نہ ہو سکی۔ اب تو حالت یہ ہے کہ خدا کا جو بندہ بھی گھر سے نکلتا ہے، وہ اقامتِ دین سے کم تر بات نہیں کرتا، حالانکہ تزکیۂ نفس، اپنی ذاتی تربیت، اصلاحِ معاشرہ اور اقامتِ دین کی نوعیت پرائمری اور یونیورسٹی کی تعلیم کی سی ہے۔ اگر کوئی گروہ پرائمری تعلیم حاصل کیے بغیر یونیورسٹی میں داخل ہونا چاہتا ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ ہم نے تو معاشرے کی اصلاح کے لیے قومی سطح پر کوئی ایک بھی ادارہ قائم نہیں کیا ہے۔ آخر بدی کی وہ طاقتیں جو ہمارے معاشرے میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور نہایت ہی مضبوط ہیں، انتظامیہ میں بھی، فوج جاگیر دار اور صنعت کار طبقہ میں، پھر خارجی طور پر بین الاقوامی طاقتیں، پھر ان کے پاس وسائل بھی بے پناہ ہیں اور ان کے ہاں تنظیم بھی ہے۔ اتنی بڑی قوت سے آپ چند بے تربیت افراد کی مدد سے کیسے لڑ سکتے ہیں۔

بڑی عمارت کی تعمیر کے لیے پہلے اس کی بنیادوں کے استحکام کا سامان ہونا ضروری ہے۔ اس سامان سے پہلے اگر عمارت قائم بھی ہو جائے تو وہ جلد ہی گر جائے گی۔ بد قسمتی سے یہ نکتہ ہمارے ''نئے دانش وروں'' کو سمجھ میں نہیں آتا۔ کاش کہ ہم قوم کو جذباتی نعروں کے ذریعہ سطحی کاموں میں لگانے کی بجائے صحیح خطوط میں ان کی تربیت کا نظام قائم کر لیں اور آنے والے مصلحین کو ایسے لوگ فراہم کر کے دیں جن کے مضبوط کردار، جذبۂ جہاد

اور تقویٰ سے فائدہ اٹھا کر وہ کوئی بڑا معرکہ سر انجام دے سکنے کے قابل ہو سکیں۔ اگر موجودہ صورتِ حال رہی تو نہ اقامتِ دین کا کام ہو گا اور نہ ہی معاشرے میں تربیت کی مستحکم بنیادیں رکھی جا سکیں گی۔

والسلام

محمد موسیٰ بھٹو

حیدر آباد

---

۲۲ نومبر ۱۹۸۵

محترم و مکرم جناب بھٹو صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

عنایت نامہ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ آپ نے مضمون پسند کیا، کتابیں ارسال فرمائیں، آپ کی عنایت ہے۔

آپ نے جس کام کی طرف توجہ دلائی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کرنے کا اصل کام وہی ہے۔ دین کے فکری غلبہ کے بغیر کوئی کام کرنا ممکن نہیں اور یہ چیز اعلیٰ علمی اداروں کے قیام ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم نے 'المورد' اسی مقصد کے پیشِ نظر قائم کیا ہے۔ آپ بھی اسی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ جو کچھ ہمارے بس میں ہے، ہم ان شاءاللہ کریں گے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ صحیح سمت میں کی جانے والی مساعی کو ضائع نہیں کریں گے۔

والسلام

—— جاوید احمد

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

''اشراق'' کے نام خطوط میں پوچھے گئے

سوالات پر مبنی مختصر جوابات کا سلسلہ

قرآن میں لفظ 'کافر' کا استعمال

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سوال: ''اشراق'' فروری ۲۰۰۰ کے ''یسئلون'' میں قرآنِ مجید میں لفظ 'کافر' کے لغوی استعمال کے بارے میں سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ ''کافر کے معنی ہیں انکار کرنے والا۔ قرآن میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔'' اس جواب سے یقیناً قاری کو اطمینان نہ ہوا ہو گا۔ کیا آپ میرا حسبِ ذیل جواب شائع کریں گے؟

قرآن میں لفظ کافر اپنے لغوی معنی میں سورۂ حدید کی آیت ۲۰ میں استعمال ہوا ہے۔ 'اعجب الکفار نباته' یعنی کسانوں کو اپنی زمین میں اگی ہوئی ہریالی اچھی یا فصل اچھی لگتی ہے۔

عربی لغت میں 'کفر' (باب ضرب یضرب سے) چھپانے کے معنی میں آتا ہے۔ کسان کو کافر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زمین میں ہل چلا کر بیج اس میں ڈالتا ہے۔ جو مٹی میں چھپ جاتے ہیں۔ انکار کے معنی باب نصر ینصرُ سے ہیں۔ سورۂ حدید کی آیت مذکورہ بالا میں لفظ 'الکفار' کے یہی معنی کسان، تفسیر قرطبی اور تفسیر ابنِ کثیر وغیرہ میں مذکور ہیں۔ (رضوان علی ندوی، کراچی)

جواب: شاید آپ کے مطالعے میں نہیں آیا کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی تاویل کرتے ہوئے لفظ 'کفار' کے یہ معنی نہیں لیے اور اپنی ترجیح کے دلائل بھی دے دیے ہیں۔ آپ ''تدبرِ قرآن'' میں

لکھتے ہیں:

''آیت میں لفظ 'کفار' بھی قابل غور ہے اس کے معنی مفسرین نے عام طور پر 'زرّاع' یعنی کسانوں کے لیے ہیں۔ لیکن دل اس پر نہیں جمتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ اس معنی میں معروف نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جس مادے سے ہے اس کے اندر یہ معنی لینے کی گنجایش ہے۔ لیکن محض اتنی بات ایک ایسے لفظ کو جو ایک اصطلاح کی حیثیت سے، ایک خاص مفہوم میں قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، ایک ایسے شاذ معنی میں لینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جس معنی میں اس کی کوئی مثال قرآن میں نہیں ہے۔ سورۂ فتح کی آیت ۲۹ 'فاستوی علی سوقه یعجب الزراع لیغیظ بهم الکفار' (پس وہ کھیتی اپنے تنوں پر کھڑی ہو گئی کسانوں کے دلوں کو لبھاتی ہوئی کہ ان سے کافروں کے دل آزردہ ہوں) میں دونوں لفظ اپنے اپنے خاص معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اپنے معانی میں معروف و متعین ہیں۔ اس وجہ سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں 'کفار' اپنے اصل مفہوم ہی میں ہے۔ چونکہ اس تمثیل میں پیشِ نظر منکرین آخرت ہی کے رویہ کو نمایاں کرنا ہے۔ اس وجہ سے فرمایا ہے کہ اس دنیا کی عارضی رونقیں منکرینِ آخرت کے دلوں کو لبھا لیتی ہیں۔ وہ انھی کے اندر پھنس کے رہ جاتے ہیں۔ اور بالآخر اس عذاب سے دوچار ہوتے ہیں۔ جو اس قسم کے محروم القسمت لوگوں کے لیے مقدر ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ تمثیل و تشبیہ میں بعض اوقات ایسے الفاظ داخل کر دیے جاتے ہیں جن سے مقصود ان لوگوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جو اس تشبیہ یا تمثیل میں پیشِ نظر ہوتے ہیں..... '' (ج ۸ ص ۲۲۱)

مولانا امین احسن اصلاحی نے اس پیرے میں تین نکات کو فیصلے کی بنیاد بنایا ہے۔ ایک یہ کہ یہ اس لفظ کے معروف معنی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک دوسرے مقام پر اسی طرح کی تمثیل میں دونوں لفظ یکجا آئے ہیں اور اس میں لفظ 'کفار' اپنے اصلی معنی میں آیا ہے۔ تیسرے یہ کہ تشبیہ یا تمثیل میں وہ الفاظ داخل کر دیے جاتے ہیں جو مقصود کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ تینوں نکات بات کو حتمی کر دیتے ہیں۔ جب آیت کی تاویل معروف معنوں میں ہو۔ اس سے بلاغت بھی واضح ہو تو پھر ایک بعید معنی لینا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

حکمران اور کفرِ بواح

سوال: کیا مسلمانوں کی موجودہ حکومتیں سود کے متعلق قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں واضح

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

احکام کی نفی کر کے یعنی سودی نظام کو حرام سمجھتے ہوئے بھی اسے اپنا کر کفرِ بواح کی مرتکب نہیں ہو رہیں۔ ان حالات میں ان کی اطاعت کس طرح جائز ہو سکتی ہے؟ (حبیب الرحمٰن ڈیرہ غازی خان)

جواب: کفر بواح کے ارتکاب کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے کسی صریح حکم کو ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ ضیاء الحق مرحوم اور ان کے بعد کے حکمرانوں کے اقدامات میرے مشاہدے میں ہیں۔ میرے علم کی حد تک ان میں سے کوئی بھی سود کی حرمت سے انکار نہیں کرتا اور نہ سودی نظام کو قائم رکھنے پر مصر ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ سود کے بغیر بینکنگ کی کوئی صورت پیدا ہو تو وہ اسے نافذ کریں۔ اب بھی حیلہ ہی سہی نفع و نقصان میں شراکت کے اکاؤنٹ قائم کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں اس صورتِ حال میں موجودہ نظام کا تسلسل غلط ہونے کے باوجود حکمرانوں کو کفرِ بواح کا مرتکب نہیں بناتا۔

حکمران کی اطاعت ہمیشہ 'فی المعروف' کی شرط کے ساتھ ہوتی ہے۔ ریاست کے جو قوانین قرآنِ مجید اور سنت کے صریحاً خلاف ہیں ہم ان کی اطاعت نہیں کریں گے۔ خواہ حکمران کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں اور انھوں نے بالعموم اسلامی احکام کا نفاذ ہی کیوں نہ کر رکھا ہو۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ایک تنقید

سوال: ہماری فقہ لایعنی مسئلوں کا طومار ہے۔ فقہا حیلے تراشتے اور خود ساختہ دین پیش کرتے ہیں۔ آپ لوگ تصوف پر بنیادی تنقید کرتے ہیں لیکن فقہ اور فقہا کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں۔ یہ آپ کی علمی بے ایمانی نہیں تو اور کیا ہے؟ (عمران خواجہ سیالکوٹ)

جواب: آپ کا سوال زبان و بیان اور اخلاق کے اعتبار سے ناقابلِ اشاعت تفصیلات پر مشتمل تھا میں نے اس کی موزوں تلخیص کر دی۔ آپ کا یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ ہم نے ہر غلط بات سے براءت کا اظہار کرنے ہی کو اپنا طریق کار ٹھیرایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارا کام صرف انھی غلط افکار کی تردید تک محدود رہا ہے جن کا دائرۂ اثر وسیع ہے یا جن کی تردید کرنا کسی خاص وقت پر ضروری معلوم ہوا ہے۔ فقہ کے جس غلط پہلو کی آپ نے نشان دہی کی ہے اس میں ہم آپ سے متفق ہیں۔

جہنم کا عارضی ہونا

سوال: سید سلیمان صاحب ندوی نے ''سیرت النبی'' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جنت کے

بر عکس جہنم ہمیشہ قائم نہیں رہے گی اور ایک روز آئے گا جب کافروں کو دوزخ سے نکالا جائے گا۔ قرآنی اسلوب کے مطابق اس رائے میں کہاں تک حقیقت ہے، جبکہ جمہور علما کی رائے اس کے بر عکس ہے ؟ (محمد صفتین راولپنڈی)

جواب: قرآنِ مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں بصراحت بیان ہوا ہو کہ بالآخر دوزخ ختم ہو جائے گی۔ مولانا ندوی کی ساری بحث بعض الفاظ کے اشارات کو متعین کرنے سے متعلق ہے۔ یہ بات بالبداہت واضح ہے کہ اس نوعیت کی بحث سے کوئی حتمی نتیجہ نکالنا ممکن نہیں ہوتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس باب میں خاموشی ہی بہتر ہے۔

مہر معاف کرانا

سوال: مہر کی ادائیگی کا صحیح وقت کون سا ہے مہر ادا کیے بغیر نکاح ہو جاتا ہے کیا مہر بخش دینا چاہیے ؟ (محمد صفتین راولپنڈی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جواب: بہتر تو یہی ہے کہ مہر بوقتِ نکاح یا پہلی ملاقات کے موقع ہی پر ادا کر دیا جائے۔ لیکن مہر کا تقرر کرتے ہوئے اس بات کی گنجایش ہوتی ہے کہ مہر کی ادائیگی کے لیے بعد کا کوئی وقت طے کر لیا جائے۔ مہر کی رقم ادا کیے بغیر نکاح ہو جاتا ہے۔ لیکن مہر ادا نہ کرنا ایک نامعقول روش ہے۔ اگر کوئی مجبوری ہو تو مہر بخشا درست ہے لیکن مرد کی طرف سے اس کا مطالبہ پسندیدہ نہیں ہے۔

بدعت کی تعریف

سوال: بدعت کی تعریف کیا ہے ؟ کیا عبادات میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ ایک ایسا عمل جو آپ نے مستقل طور پر نہ کیا ہو اسے مستقل طور پر کرنا بدعت کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں ؟ کیا نماز باجماعت کے بعد اجتماعی دعا مانگنا اس میں شامل ہے ؟ (محمد صفتین راولپنڈی)

جواب: کسی نئی چیز کو دین میں شامل کرنا بدعت ہے۔ یعنی جو چیز دین کا حصہ نہیں تھی اسے دین قرار دینا بدعت کا ارتکاب ہے۔ اسی طرح دین میں کسی چیز کے محل کو تبدیل کرنا بھی اسے بدعت بنا دیتا ہے۔ مثلاً کسی نفلی عمل کو لازم کر دینا یا کسی جائز عمل کی ایسی صورت بنا دینا کہ وہ ہیئت دین میں نئی ہو مثلاً اذان سے پہلے درود کا

التزام کرنا۔ اسی طرح نماز کے بعد اجتماعی دعا اس دوسری شق کے تحت ہے۔ ہمارے ہاں اسے نماز کے لازمی حصے کے طور پر کیا جاتا ہے اور یہی چیز اسے بدعت بنا دیتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

"المیۂ تاریخ"

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مصنف	:	ڈاکٹر مبارک علی
قیمت	:	۱۸۰روپے
ناشر	:	فکشن ہاؤس ۱۸مزنگ روڈ لاہور

اس کتاب کا موضوع تاریخ کے لکھنے اور اس کے مطالعے کی نئی جہتوں کا سراغ دینا ہے۔ مصنف کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو سیاسی اور مذہبی مقاصد کے تحت لکھی گئی تاریخ کی کتابوں کے اثرات سے بچائے اور اسے معروضی طرزِ فکر اپنانے کی طرف راغب کرے۔ اس اعتبار سے مبارک علی صاحب نے مختلف ادوار کا تجزیہ کیا ہے اور مختلف النوع مورخین کے کام پر نقد کیا ہے۔ چنانچہ ہمیں مختلف تاریخی ادوار کے بارے میں خود مصنف کے اپنے نقطۂ نظر کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مصنف کے مباحث چشم کشا ہیں۔ وہ ہمارے دل و دماغ میں نئے روزن کھولتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصنف خود بھی بعض پہلوؤں سے متعصبانہ نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ مصنف مارکسی نظریۂ تاریخ سے شدید طور پر متاثر ہے۔

ہمیں مصنف کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق ہے کہ پچھلی صدیوں میں مذہب کو مراعات یافتہ طبقات نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں بھی یہ روش بالعموم اختیار کی گئی ہے بلکہ یہ پہلو زیادہ شدت سے نمایاں ہوا ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ نظریات کے فروغ و زوال میں معاشی اور سماجی حالات کے عنصر کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ آزادی کے بعد پاکستان کے حالات کو درست کرنے کی اصلاً کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ معاشرے کے استحکام کے عناصر روز بروز منتشر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے نکات کے بیان میں واقعتاً مصنف نے سچ کی شمع روشن کی ہے۔ لیکن خود اسلام کے بارے میں مصنف کا نقطۂ نظر درست محسوس نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کتاب کا موضوع تاریخ ہے اور اس میں اسلام پر براہِ راست کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا گیا لیکن الفاظ کے در و بست میں اس کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اصل اسلام اور تاریخی ادوار میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے رویے کو الگ کر کے نہیں دیکھ سکا، یعنی وہ اسلام جو فرد اور معاشرے میں اعلیٰ اقدار کے فروغ کا علم بردار ہے۔ وہ اسلام جو خدا اور بندے کے تعلق کو صحیح خطوط پر استوار کرتا ہے۔ وہ اسلام جو نہ کسی پاپائیت کا قائل ہے اور نہ کسی خاص طبقے کے مفادات کا محافظ ہے۔ وہ اسلام جو جاگیر داری، سرمایہ داری اور نسلی اور لسانی امتیازات کے خلاف ہے، ان کی کتاب میں ایک منزل کی حیثیت سے نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس وہ اسلام کی ان تعبیرات کو اسلام سمجھتا ہے جو مختلف سماجی اور فکری تغیرات کے تحت وجود میں آئیں، بعض طبقات کے مفادات کے تحفظ اور بعض طبقات کے ردِ عمل کے اظہار کا ذریعہ بنیں۔ یوں شائد مصنف مسلمان ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اسلام پر تنقید میں حق بجانب سمجھتا ہے۔

کتاب کا طرزِ تحریر سادہ اور سلیس ہے۔ مصنف اپنی بات کو سمجھانے کی اہلیت رکھتا اور قاری کو پوری طرح متاثر کرتا ہے۔ کتاب کی پروف ریڈنگ کافی ناقص ہے۔ امید ہے اگلے ایڈیشن میں اس کی تلافی کی جائے گی۔ یہ کتاب تبصرے کے لیے نہیں آئی تھی لیکن اپنے مباحث کی وجہ سے قابل تبصرہ ٹھیری۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

محمد بلال

''نورِ بصیرت'' عام کرنے والے کی رحلت

''مسلمان حکمران ـــــ تین بنیادی تقاضے'' موضوع تھا۔ مقرر جناب جاوید احمد غامدی تھے۔ تقریب کے صدر پروفیسر مرزا محمد منور تھے ـــــ یہاں یہ ذہن میں رہے کہ پروفیسر صاحب اور جاوید صاحب کے مابین گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد اور شاگرد کا تعلق قائم رہ چکا تھا ـــــ تقریر کا اختتام ہوا، میزبان نے صدر کو اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ صدر ڈائس کے سامنے آئے اور اپنی گفتگو کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

''معزز خواتین و حضرات آپ نے جاوید احمد غامدی صاحب کی تقریر سنی۔ جس خلوص کے ساتھ انھوں نے معاملات آپ کے سامنے رکھے میری کج مج بیانی اس معیار پر پوری نہیں اترتی.....''

اور اختتام ان الفاظ سے کیا:

''میں سمجھتا ہوں میں نے، جتنے روشن الفاظ میں عزیزِ محترم گفتگو کر رہے تھے اس کی روشنی کو کچھ دھندلایا ہے۔ لیکن صدر بے چارہ بھی مجبور ہے اور کرسی کی لاج رکھنے کے لیے کچھ بولنا ہی پڑتا ہے تو میں نے بھی گستاخی کر لی ہے۔ والسلام علیکم۔''

حیرت ہوتی ہے یہ کیسے پروفیسر ہیں، یہ کیسے استاد ہیں، یہ کیسے ملکی سطح کے بزرگ علمی رہنما ہیں جو اپنی عمر سے بہت چھوٹے، علمی دنیا میں نووارد اور اپنے شاگرد کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔

یہاں پروفیسر صاحب، جاوید صاحب کے الفاظ کو روشن قرار دے رہے ہیں اور اپنے الفاظ کو ان الفاظ کی روشنی کو دھندلانے کا باعث قرار دے رہے ہیں، مگر وسیع القلبی کے نقطۂ نگاہ سے سوچیں تو یہ بات بلاخوفِ تردید کہی

جاسکتی ہے کہ پروفیسر صاحب کے یہ ''دھندلانے والے'' الفاظ درحقیقت خود روشن ترین الفاظ ہیں۔

آہ! یہ روشن ترین الفاظ ادا کرنے والے، اقبالیات کے ماہر، تنقیدی اور تحقیقی ادب کے خادم، اقبال اور قائداعظم کے مخلص محب، تحریکِ پاکستان کے ممتاز دانش ور، اردو اور انگریزی زبانوں کی درجنوں کتابوں کے مصنف، ۷ فروری ۲۰۰۰ کو پیر کے دن صبح دس بجے انتقال کر گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی عمر ۷۷ سال تھی۔ آپ گزشتہ کئی ماہ سے صاحبِ فراش تھے۔ دل، دمہ اور ذیابیطس کے مریض تھے۔ اگرچہ آپ کے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

پروفیسر صاحب شریف النفس، دیانت دار، درویش طبع، فیاض، کھرے اور ایک بے باک انسان تھے۔ آپ بہت محبِ وطن تھے۔ اس محبت کا ایک مظہر ان کا لباس بھی تھا۔ آپ نے ساری عمر قومی لباس پہنا۔ آپ کے سر پر جناح کیپ اور تن پر شیروانی ہوتی تھی۔

آپ کی شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو فکرِ اقبال کا فہم اور فروغ تھا۔ اقبالیات پر آپ کے کام ہی کی وجہ سے آپ کو صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی عطا کیا گیا۔ تعلیم کے میدان میں بھی آپ نے نمایاں خدمات انجام دیں جس کے صلے میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے آپ کو ۱۹۹۷ء میں ستارۂ امتیاز ملا۔

آپ کے والد صاحب مرزا ہاشم الدین ایک اسکول میں پڑھاتے تھے اور والدہ صاحبہ محلے کی لڑکیوں کو قرآن کی تعلیم دیتی تھیں۔ آپ ۷ مارچ ۱۹۲۳ء کو بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ریلوے میں اور پھر محکمہ انہار میں کلرک کے طور پر ملازمت کی۔ بی اے پرائیویٹ طور پر کیا۔ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے اردو میں، ۱۹۵۳ء میں عربی میں اور ۱۹۶۷ء میں فلسفہ میں ایم-اے کیا۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۱ء تک گورنمنٹ کالج، فیصل آباد میں اردو کے لیکچرر رہے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۰ء تک گورنمنٹ کالج، لاہور میں اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کے شعبہ اقبالیات کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک اقبال اکادمی، پاکستان کے جز وقتی اور ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۳ء تک کل وقتی ڈائریکٹر رہے۔ آپ نے ۲۱ ویں اسکیل میں اپنی خدمات انجام دیں۔ ۸ سال تک وی آئی پی کی حیثیت حاصل رہی۔

آپ اقبال اکادمی، پاکستان کی گورننگ باڈی، مرکزی مجلسِ اقبال لاہور، مرکزی زکوٰۃ کونسل، حمایتِ اسلام لاہور کی انتظامی کمیٹی، منصوبۂ بابِ پاکستان کمیٹی، پنجاب آرٹس کونسل، ریڈیو پاکستان کی گورننگ باڈی، پاکستان

ٹیلی وژن لاہور کی ایڈوائزی باڈی کی سطح اور نوعیت کے کئی اداروں کے ممبر رہے۔

آپ اردو، انگریزی، عربی، پنجابی اور فارسی زبان میں مہارت رکھتے تھے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف اور روزنامہ ''نوائے وقت'' کے مستقل مضمون نگار تھے۔

شاعرِ مشرق نے عالم کے پروردگار کے حضور میں یہ دعا کی تھی:

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اس بات میں رتی برابر بھی شبہ نہیں کہ پروفیسر صاحب کی زندگی کا مرکز و محور شاعرِ مشرق کا نورِ بصیرت عام کرنا ہی تھا۔

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی قیامت تو واقع ہو جاتی ہے۔ وہ عالم برزخ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ نیک ہو تو اس کو جنت دکھائی جاتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شاعرِ مشرق نے کہا تھا:

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل اگر کوئی دفتر میں ہے

مجھے یقین کی حدود کو چھوتا ہوا گمان ہے کہ پروفیسر صاحب کے ''دفتر'' میں اتنا ''عمل'' موجود ہے کہ جس کے صلے میں اس وقت عالمِ برزخ میں انھیں جنت دکھائی جا رہی ہو گی۔

(جاری)

خورشید ندیم

ایک علمی روایت کا خاتمہ

۳۱ دسمبر کی شب، جب بیسویں صدی رخصت ہوئی تو اس کے ساتھ علم و فضل کا وہ چراغ بھی بجھ گیا جو برصغیر پاک و ہند کی مشترکہ اور روشن علمی روایت کا آخری امین تھا۔ ایک طرف ماہ و سال کے پیمانے سے ایک عہد کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف فکر و نظر کا ایک دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس رات ندوۃ العلما کے عظیم فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنے پروردگار کے حضور میں جا پہنچے، جہاں ہم سب کو ایک معین وقت پر حاضر ہونا ہے۔

نظری اعتبار سے انیسویں صدی کو مغرب میں ''افکار کا دور'' (Age of Idealogy) کہا گیا ہے۔ کانٹ، کومٹے، مل، سپنسر، نیطشے، شوپن ہائر، ہیگل، مارکس —— صاحبانِ فکر و نظر کی ایک کہکشاں ہے جو اس صدی کے آسمان پر بکھری ہوئی ہے۔ اس عہد میں فلسفۂ تاریخ کو علم کی دنیا میں یہ مقام ملا کہ انسان کی قسمت سازی میں وہ ایک بڑا عامل قرار پایا۔ دنیا مارکس کی جدلیاتی مادیت (Dialactical Materialism) نیطشے کے ''سپر مین'' اور فلسفۂ جرمنی کے تصورِ خودی (Egoism) سمیت ان گنت نئی فکری تعبیرات سے آشنا ہوئی۔ بالکل اسی طرح بیسویں صدی میرے نزدیک مسلم فکر کے حوالے سے افکار کا دور (Age of Muslim Idealogy) ہے۔ ایک طرف مصر میں محمد عبدہ، رشید رضا، حسن البنا، سید قطب شہید اور محمد الغزالی جیسے حضرات نے علم و عرفان کا چراغ روشن کیا۔ اور دوسری طرف ایران و عراق کی سرزمین پر ابوالقاسم الخوئی، باقر الصدر، مرتضیٰ مطہری اور علی شریعتی جیسے لوگوں کا غلغہ بلند ہوا۔ انڈونیشیا میں محمد ناصر اور شمالی افریقہ میں مالک بن بنی جیسے

صاحبانِ علم کا ظہور ہوا۔ برصغیر کا معاملہ تو سب سے منفرد رہا سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، علامہ محمد اقبال، حمید الدین فراہی، ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور امین احسن اصلاحی جیسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے جن کے افکار نے آج بھی ایک زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ سر سید احمد خان اگرچہ ۱۸۹۸ء میں دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن ان کے افکار نے بیسوی صدی کے برصغیر کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا، اسی وجہ سے ہم ان کا شمار بیسویں صدی کے مفکرین میں کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کانٹ کا انتقال تو انیسویں صدی کے اوائل (۱۸۰۴ء) میں ہو گیا تھا لیکن وہ بجا طور پر اس صدی کے مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔

برصغیر میں جنم لینے والی فکری روایت میں ایک نام مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بھی ہے جو علی میاں کے نام سے بھی معروف ہیں۔ ایک متوازن دینی فکر کے فروغ میں ندوۃ العلما کا اپنا حصہ ہے۔ ندوہ نے جو بڑے لوگ پیدا کیے، ان میں ایک علی میاں بھی تھے۔ اپنے علم و فضل اور حسنِ سیرت کے اعتبار سے وہ فی الواقع ہمارے اسلاف کی نشانی تھے، وہ علما کے اس کردار کی عملی تصویر تھے جس کا ذکر قرآنِ مجید نے کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ساری عمر ایک داعی اور نذیر بن کر جیے۔ انھوں نے "انذار" کی وہ ذمہ داری بحسن و خوبی سر انجام دی جس کا تذکرہ سورۂ توبہ (۹: ۲۲) میں 'تفقه فی الدین' رکھنے والوں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ مولانا نے تمام عمر ایک غیر مسلم ریاست میں گزاری، لیکن وہ پوری امت کے لیے فکر مند رہے اور ہر جگہ مسلمانوں کے درد کو انھوں نے اپنا درد سمجھا۔ اس میدان میں بلا شبہ ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ مسلمان حکمرانوں سے مخاطب ہوتے تو یہ درد ان کے الفاظ میں ڈھل جاتا۔ کوئی اس درد کو محسوس کرنا چاہے تو ان کے ایسے خطوط پڑھ لے جو انھوں نے عرب دنیا کے اربابِ اقتدار کو لکھے۔ یہ خطوط اردو میں بھی "حجازِ مقدس اور جزیرۃ الاعرب" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ جس متانت اور وقار کے ساتھ اپنی بات کہتے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیا جا سکتا ہے جو مجھے ایک محترم دوست، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے استاد ڈاکٹر محمد الغزالی نے سنایا اور جسے ایک سعودی عالم نعمان ثمر قندی نے روایت کیا۔ وہ کچھ عرصہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں بھی استاد رہے۔ نعمان ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں جب علی میاں، شاہ فیصل شہید سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے، مولانا شاہی محل کے کمرۂ ملاقات میں داخل ہوئے تو بہت دیر تک اس کی چھت اور در و دیوار کی طرف حیرت اور استعجاب کے ساتھ دیکھتے رہے۔ شاہ فیصل نے اس کا سبب پوچھا تو مولانا گویا ہوئے: "میں نے بادشاہوں کے دربار کبھی نہیں دیکھے۔ آج پہلا تجربہ ہے، اس لیے محوِ حیرت ہوں۔ میں جس سرزمین سے تعلق رکھتا ہوں، وہاں اب

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بادشاہ نہیں ہوتے، لیکن تاریخ کا ایک دور ایسا بھی تھا جب وہاں بھی بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ میں نے تاریخ میں ایسے بہت سے لوگوں کا بارہا تذکرہ پڑھا ہے۔ آج اس دربار میں آیا ہوں تو ایک تقابل میں کھو گیا ہوں.....''

جو لوگ مولانا کے عربی زبان کے ذوق سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ علی میاں ایسی فصیح و بلیغ زبان لکھتے اور بولتے تھے کہ اہلِ عرب بھی اس کے سحر میں کھو جاتے۔ عرب بہت کم کسی کی عربی دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ علی میاں ہمارے عہد کے شاید واحد عجمی ہیں جن کی فصاحت و بلاغت کو وہ رشک بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ مولانا اگر عہدِ جاہلیت میں ہوتے تو عرب کے فصحا، ان کی زبان دانی کے اعتراف میں ان کو سجدہ کرتے۔ ان کی یہی فصاحت تھی جس نے شاہ فیصل کو مبہوت کر رکھا تھا اور وہ ہمہ تن گوش مولانا کے سامنے کھڑے تھے۔ مولانا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں بھی ایک بادشاہ ہو گزرا ہے۔ آج کا بھارت، پاکستان، سری لنکا، برما، نیپال، دور دور تک اس کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے باون سالہ عہدِ اقتدار میں بیس برس گھوڑے کی پیٹھ پر گزارے۔ اس کے دور میں مسلمان آزاد تھے، خوش حال تھے، ان کے لیے آسانیاں تھیں، لیکن بادشاہ کا حال یہ تھا کہ وہ پیوند لگے کپڑے پہنتا۔ وہ قرآنِ مجید کی کتابت کر کے اور ٹوپیاں بنا کر گزراوقات کرتا۔ رات بھر اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑا رہتا اور اس کے دربار میں اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا۔ اس وقت مسلمان حکمران غریب اور سادہ تھے اور عوام خوش حال اور آسودہ۔ آج آپ کا یہ محل دیکھ کر خیال آیا کہ سب کچھ کتنا بدل گیا ہے۔ آج ہمارے بادشاہ خوش حال ہیں اور بڑے بڑے محلات میں رہتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ فلسطین میں بے گھر ہیں، کشمیر میں ان کا لہو ارزاں ہے، وسطی ایشیا میں وہ اپنی شناخت سے محروم ہیں۔ آج میں نے آپ کے محل میں قدم رکھا تو اس تقابل میں کھو گیا۔''

راوی کا بیان ہے کہ جب علی میاں خاموش ہوئے تو شاہ فیصل کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ اب ان کی باری تھی۔ پہلے ان کے آنسو نکلے، پھر ہچکی بندھ گئی۔ اس کے بعد وہ زار زار رونے لگے وہ اتنی بلند آواز سے روئے کہ ان کے محافظوں کو تشویش ہوئی اور وہ بھاگتے ہوئے اندر آ گئے۔ شاہ فیصل نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کو کہا۔ پھر مولانا سے مخاطب ہو کر بولے: ''وہ بادشاہ اس لیے ایسے تھے کہ انھیں آپ جیسے ناصح میسر تھے۔ آپ تشریف لاتے رہیں اور ہم جیسے کمزور انسانوں کو نصیحت کرتے رہیں۔'' اس ملاقات میں شاہ فیصل نے ندوۃ العلما کے لیے ایک خطیر رقم پیش کرنا چاہی، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور کہا کہ ندوہ کے معاملات اللہ تعالیٰ

کی عنایت سے بہتر طور پر چل رہے ہیں۔

علی میاں ایسے شائستہ اطوار تھے کہ ان کے معاصرین میں کم لوگ ان کی مثل کے ہوں گے۔ وہ ایک دور میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے متاثر ہوئے اور جماعتِ اسلامی کے رکن بن گئے، لیکن جلد ہی علیحد گی اختیار کر لی۔ افتادِ طبع کے اعتبار سے وہ ایک زاہد اور عبادت گزار آدمی تھے، اس لیے انھیں تبلیغی جماعت میں زیادہ کشش محسوس ہوئی اور انھوں نے اپنی راہیں جدا کر لیں، لیکن یہ کام اتنی خاموشی سے ہوا کہ بہت کم لوگوں کو اس کی خبر ہوئی۔ بہت عرصے کے بعد انھوں نے اس اختلاف کا برملا اظہار کیا جو ان کی جماعت سے علیحد گی کا سبب بنا۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا مودودی کی تعبیرِ دین میں سیاست کی طرف جھکاؤ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں ایک عدمِ توازن پیدا ہو گیا ہے۔ اس افراط کے باعث وہ شخصیت وجود میں نہیں آتی جو دین میں مطلوب ہے۔ انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار اپنی کتاب ''عہدِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح'' میں کیا ہے۔ اس اختلاف کو بیان کرتے وقت انھوں نے مولانا مودودی کے علمی وقار اور دینی خدمات کا لحاظ رکھا اور کہیں بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ مولانا مودودی کے ساتھ احترام اور محبت کا تعلق مولانا کی وفات تک باقی رہا۔ مولانا مودودی کا معاملہ تو ایک طرف رہا، ان کی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ جب انھوں نے ''قادیانیت'' کے عنوان سے کتاب لکھی تو اس میں غلام احمد قادیانی کا تذکرہ ''غلام احمد صاحب قادیانی'' کے الفاظ سے کیا۔ بلاشبہ یہی ایک حقیقی داعی کی شان ہے۔ وہ مناظرہ باز اور کج بحث نہیں ہوتا۔ اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ مخاطب تک حق کی بات پہنچا دے تاکہ وہ پلٹ آئے، وہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے نہیں ہوتا۔

علمی اعتبار سے اگرچہ انھوں نے ''تدبرِ قرآن'' یا ''تفہیم القرآن'' جیسی کوئی یادگار نہیں چھوڑی لیکن اس کے باوجود ان کا تحقیقی و تصنیفی کام اتنا وقیع ہے کہ بیسویں صدی کے مسلم فکر کے ارتقا کا جائزہ لیتے وقت اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ ''نبیِ رحمت'' کے ذکرِ جمیل سے لے کر ایک مؤرخ کی طرح انھوں نے چھ جلدوں میں ''تاریخِ دعوت و عزیمت'' مرتب کی۔ ''مطالعۂ قرآن کے مبادی اصول'' اور ''حدیث کا بنیادی کردار'' جیسے مسائل پر ایک جید عالم کی طرح قلم اٹھایا۔ ''معرکۂ ایمان و مادیت'' سے لے کر ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' جیسے عصری مسائل کو بھی موضوع بنایا۔ ان کے پاس ایک سوانح نگار کا قلم تھا اور ایک مصلح کا بھی۔ علامہ اقبال سے انھیں گہری عقیدت تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ پہلے آدمی تھے جنھوں نے موثر طور پر عالمِ عرب کو اقبال سے متعارف کرایا۔ مولانا کی یہ کتاب ''نقوشِ اقبال'' کے عنوان سے

اردو میں بھی ترجمہ ہوئی۔ اقبال کے ساتھ ان کی یہ محبت آخر دم تک باقی رہی۔ جی چاہتا ہے کہ انھیں اقبال ہی کے الفاظ میں آخری بار مخاطب کیا جائے۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی ترا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سفرنامہ

محمد بلال

میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں!

۱۹۹۹ء کا رمضان میرے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک خاص رحمت لے کر آیا۔ سعودی عرب میں مقیم میرے بڑے بھائی غلام مصطفیٰ صاحب کی دعوت اور اہتمام میں اس مہینے، میں نے عمرے کی سعادت حاصل کی۔ بیت اللہ جیسے انتہائی غیر معمولی بابرکت مقام کی زیارت کی۔ بیت اللہ کا طواف کیا۔ حطیم میں نوافل ادا کیے۔ حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ آبِ زم زم کے چشمے کے پاس آبِ زم زم پیا۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ بیت اللہ کے بالکل قریب بیٹھ کر نماز جمعہ ادا کی۔ صفا کی پہاڑی پر بیٹھ کر بیت اللہ کو جی بھر کر دیکھا۔

O

بس بڑی تیزی کے ساتھ جدہ سے مکہ کی جانب چل رہی تھی۔ میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میرے والد صاحب، بڑے بھائی، بھابی، دو بھتیجیاں اور کزن ابو بکر صدیق میرے ہمراہ تھے۔ سب نے احرام باندھے ہوئے تھے۔ جب مکہ کے سادہ اور پر اسرار پہاڑ مجھے دور سے دکھائی دینے لگے تو دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔ ''کراچی جارہے ہیں''، ''راولپنڈی جارہے ہیں''، ''فیصل آباد جارہے ہیں'' اس خیال کے ساتھ تو بہت سفر کیے ہیں مگر ''مکہ جارہے ہیں'' کے خیال کے ساتھ سفر کرتے ہوئے بار بار اپنے آپ کو یقین دلانا پڑتا تھا کہ یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔ جلیل القدر انبیاے کرام کے واقعات جو مکہ کے حوالے سے مشہور ہیں، ذہن کے پردے پر آپ سے آپ ابھر رہے تھے۔ میں نے کاغان، ناران جیسے علاقوں کے پہاڑ بھی دیکھے ہیں۔ مکہ کے پہاڑوں کے درمیان رہنے والوں کو کاغان، ناران جیسے پہاڑوں کا حسن دیکھنے کو نہیں ملا۔ اسی طرح وہاں کے میدان بھی

سبزے کی خوبی سے عاری ہیں۔ مگر انبیاے کرام کی صورت میں نخلِ فطرت کے جیسے بہترین ثمر یہاں کے رہنے والوں کو میسر آئے، وہ ناران اور کاغان کے پاس رہنے والوں کو تو حاصل نہ ہوئے، یہ سوچیں تو کہنا پڑتا ہے کہ:

یہ بہاریں تو کسی اور نے دیکھی نہ سنیں
اہلِ گلشن سے تو اچھے رہے صحرا والے

میرے ساتھ کچھ مصری بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے احرام باندھے ہوئے تھے مگر وہ مصری اور سعودی کرنسی کو آمنے سامنے رکھ کر اس کا تقابل کر رہے تھے۔

معلوم نہیں میقات کب آ جائے؟ یہ سوچ کر میں نے زبانی طور پر 'لبیک اللّٰھم لبیک.....' کا ورد شروع کر دیا۔ میقات ایک خاص مقام کو کہتے ہیں جہاں سے عمرہ یا حج کرنے والے احرام باندھتے ہیں۔ یہیں سے عمرہ یا حج کی پابندیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مکہ کی جانب چاروں اطراف میں آنے والوں کے میقات مقرر ہیں۔

ہمارے سفر کے ساتھ ساتھ لیل و نہار کا سفر بھی جاری تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانولی شام پر کالی رات غلبہ پانے لگی..... معلوم ہوا افطار کا وقت ہو گیا ہے..... ہم سب نے سفر کے دوران ہی میں کھجوروں سے روزہ افطار کیا۔ یہ افطار مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ جسم پر احرام زبان پر 'لبیک اللّٰھم لبیک.....' مکہ کے پہاڑ میرے دائیں بائیں، بیت اللہ کی زیارت کا قصد اور یہ افطار۔

راستے میں بعض مقامات پر مسجدِ حرام کے پُرعظمت مینار کے اوپر والے حصے نظر آتے تھے۔ جب یہ مینار نظر آتے دل اچھلنے لگتا۔ پورا مینار دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی۔ ان میناروں کے وسط میں موجود بیت اللہ کو دیکھنے کے لیے تڑپ پیدا ہوتی۔

مسجدِ حرام کے قریب بس رکی۔ اپنا اپنا سامان پکڑا۔ بس سے نیچے قدم رکھا۔ ''یہ مکہ کی زمین ہے'' خود کو پھر یقین دلانا پڑا۔

جلد ہی مسجدِ حرام کے ایک حصے کا بیرونی دروازہ ہمارے سامنے تھا۔ پورے مینار دیکھنے کی خواہش پوری ہو چکی تھی۔ رات کی تاریکی نے پوری طرح غلبہ حاصل نہیں کیا تھا۔ ہلکی ہلکی قدرتی روشنی ابھی موجود تھی۔ مگر میناروں کی روشنیاں جلا دی گئی تھیں۔ ان روشنیوں کا اہتمام بڑے اچھے انداز سے کیا گیا تھا۔ روشنی کا منبع نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے بڑے بلند مینار، ان پر نقش و نگار اور یہ روشنی،

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جلال اور جمال کا حسین امتزاج تھا۔ موسم بھی بہت خوش گوار تھا۔ نہ سردی تھی اور نہ گرمی۔ شکرِ خداوندی کے جذبات بار بار بڑی شدت کے ساتھ ابھر رہے تھے۔ مسجدِ حرام کے بیرونی سفید اور صاف صحن پر نمازِ مغرب ادا کی..... قریب ہی ایک ہوٹل کا کمرہ حاصل کیا..... کھانا کھا کر عمرے کے لیے مسجدِ حرام کا رخ کیا..... جیسے ہی میں نے مسجدِ حرام کے اندر پاؤں رکھا تو خود کو پھر یقین دلانا پڑا کہ میں مسجدِ حرام کے اندر ہوں۔

یکا یک مجھے اپنے کزن ابو بکر کی ایک بات یاد آگئی:

''میں جب پہلی دفعہ مسجدِ حرام میں داخل ہوا اور برآمدوں میں سے ہوتا ہوا بیت اللہ کی جانب بڑھ رہا تھا اور بیت اللہ کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ میں مشتاق نظروں سے بیت اللہ کو ڈھونڈ رہا تھا مگر برآمدوں کے بے شمار اور بڑے بڑے ستونوں کی اوٹ سے کبھی مجھے بیت اللہ کا کنارہ نظر آتا تھا، کبھی اس کا کونہ دکھائی دیتا تھا اور کبھی اس کے درمیان کا کوئی حصہ نظر آتا تھا۔ اگرچہ جلد ہی پورے بیت اللہ کی زیارت ہو گئی، مگر بعد میں ایک تشنگی سی رہی۔ لہٰذا دوبارہ بیت اللہ گیا تو میں نے برآمدوں میں سے گزرتے ہوئے اپنی نظریں فرش پر رکھیں۔ جب بیت اللہ کے صحن میں پہنچا، تب نظریں اٹھائیں۔ اب پورا بیت اللہ میرے سامنے تھا۔ اس طرح میری تشنگی ختم ہوئی۔''

میں نے ابو بکر کے تجربے سے فائدہ اٹھایا اور جب پہلی دفعہ مسجدِ حرام میں داخل ہوا تو ایسا ہی کیا۔ اس وقت نمازِ تراویح ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی نظریں فرش پر رکھیں۔ نمازیوں کے درمیان تنگ راستے سے لوگوں کی بھیڑ میں سے ہوتے ہوئے میں برآمدوں سے گزر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بیت اللہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ جسم پر کپکپی سی طاری تھی۔ خدا نے مجھ جیسے حقیر آدمی کو اپنے گھر بلایا۔ اپنا مہمان بنایا۔ اپنے گھر کی زیارت کی سعادت بخشی۔ شکرِ خداوندی سے لبریز میں بیت اللہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''بیت اللہ کا صحن آنے والا ہے'' ابو بکر نے آہستگی سے مجھے بتایا، دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ ''اللہ کا گھر جسے اب تک میں نے صرف ٹی وی پر یا تصویروں میں دیکھا تھا۔ جس کے بارے میں بڑوں سے سنا، کتابوں میں پڑھا تھا۔ وہ گھر جس کی بنیاد حضرت ابراہیم نے رکھی۔ جس کے ساتھ جلیل القدر پیغمبروں اور غیر معمولی شخصیتوں کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ جس کے قریب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔ جس کا طواف کرتے تھے۔'' غرض بیت اللہ کے پہلو سے تاریخِ اسلامی کے گوناگوں مناظر میرے تخیل کی آنکھوں کے آگے لہرا رہے تھے۔ ایک عجیب، ایک غیر معمولی، ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری تھی۔ ''آج میں بھی اس اللہ کے گھر کے قریب

جاؤں گا۔ اسے چھوؤں گا۔ اس کی زیارت کروں گا۔'' میرے اندر شکرِ خداوندی کے جذبات سمندر کی بڑی لہروں کی طرح ابھر رہے تھے۔ اسی اثنا میں دودھ کی طرح سفید، صاف شفاف بیت اللہ کے صحن پر میں نے پاؤں رکھا اور اس کے ساتھ ہی نظریں اوپر اٹھائیں..... بیت اللہ میرے سامنے تھا..... مکمل بیت اللہ..... دیکھنے میں کوئی اوٹ آڑے نہیں آ رہی تھی۔ کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو رہی تھی۔ سیاہ غلاف میں لپٹا ہوا۔ ابھری ہوئی چمکیلی خطاطی سے سجا ہوا۔ پورا بیت اللہ میرے اتنے قریب سے سامنے آیا تو اس کی عظمت کا بھرپور تاثر میرے پورے وجود پر طاری ہوا۔ میرے اندر احترام، ادب اور تشکر کے ملے جلے جذبات بڑی شدت سے بیدار ہوئے۔ دل میں مدو جزر سے اٹھنے لگے۔

جی چاہتا تھا وہاں پتھر کی طرح کھڑا ہو جاؤں اور بیت اللہ کو دیکھتا رہوں، مگر لوگوں کی بھیڑ تھی۔ وہاں کھڑے ہونا لوگوں کے لیے رکاوٹ بنتا تھا۔ ہمارا چھوٹا سا قافلہ تھا۔ احرام باندھے ہوئے تھے۔ بیت اللہ کے صحن میں داخل ہوتے ہی نمازِ تراویح پڑھنے والوں کی چند صفیں جلد ہی ختم ہو گئیں۔ طواف کرنے کی جگہ فوراً سامنے آ گئی۔ ہم بھی طواف کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ ہم بھی شمع کے گرد پروانوں کی طرح چکر لگانے لگے، سوڈانی، بنگالی، ایرانی، مصری، لبنانی، بھارتی، گورے، کالے، چھوٹے، بڑے، موٹے، پتلے، عورتیں، مرد، لڑکیاں، لڑکے، بچیاں، بچے، صحت مند، کمزور: سب اللہ کے گھر کا طواف کر رہے تھے۔ ان کی زبانیں ذکرِ الٰہی سے تر تھیں۔ سب جذبے سوئے ہوئے تھے۔ صرف ایک جذبہ بیدار تھا۔ جذبۂ عبودیت۔ خدا کا گھر جو ظاہر ہے علامتی طور پر ہی قرار دیا گیا ہے اس کے گرد چکر لگا کر اس بات کا علامتی اظہار کیا جا رہا تھا کہ اے خدا ہماری سوچوں کا، ہماری سرگرمیوں کا مرکز و محور تو ہے۔ صرف تو۔

عمرہ، حجِ اصغر ہے اور حج درحقیقت مختلف عبادات کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں اسے افضل عبادت کہا گیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں تردد تھا کہ اسلامی عبادتوں میں کون سی عبادت افضل ہے۔ جب انھوں نے حج ادا کیا تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ''اب مجھے یقین ہو گیا کہ حج تمام عبادتوں میں سب سے افضل عبادت ہے۔'' حج کے مختلف مناسک میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کا علامتی اظہار کیا جاتا ہے۔ یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس مجمل بات کی تفصیل پیش کر دی جائے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ حج و عمرہ کے بارے میں، میں نے جتنی بھی کتابوں کا مطالعہ کیا ان میں اس عبادت کے ''ظاہر'' ہی کو بیان کیا گیا تھا۔ اس کے ''باطن'' کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ یہی

وجہ ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگوں کو حج و عمرہ کے کچھ مناسک عجیب سے لگتے ہیں۔ میں خود جب پوری طرح دین کی طرف راغب نہیں تھا اور صرف نمازِ جمعہ ہی ادا کیا کرتا تھا اس وقت حج کے بعض مناسک میرے لیے بالکل ناقابلِ فہم ہوتے تھے۔ مگر جب اس عبادت کا علامتی پہلو میرے علم میں آیا اور اس کے ''باطن'' تک فکری رسائی حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ کس قدر غیر معمولی اور جامع عبادت ہے۔ اس ''ظاہر پرستی'' کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''حج کے سلسلے کی ایک بہت بڑی آفت یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگوں کو حج کے شعائر اور مناسک کی روح اور حقیقت سے بالکل بے خبری ہے، بس لوگ عقیدت کے جذبے کے ساتھ جاتے ہیں اور معلم حضرات ان سے جو رسوم ادا کرا دیتے ہیں، آنکھ بند کر کے ان کو ادا کر کے چلے آتے ہیں نہ حج اور عمرہ کا فرق معلوم، نہ طواف کی حقیقت کا پتہ، نہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کا مدعا کسی پر واضح، نہ یہ معلوم کہ سعی کیوں کی جاتی ہے، قربانی کی اصلی روح کیا ہے۔ رمی جمرات سے ہمارے اندر کس روح کو زندہ اور بیدار رکھنا مقصود ہے، اجتماعِ عرفات کی کیا حقیقت ہے۔ الغرض جتنے بھی شعائر ہیں، عام طور پر لوگ ان کو محض رسوم کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ نہ ان کی معنویت کا کسی کو کچھ پتا ہوتا ہے نہ اس چیز سے لوگوں کو آگاہ کرنے کا کوئی معقول انتظام و اہتمام ہے اور نہ بظاہر اس چیز کے لیے لوگوں کے اندر کوئی طلب ہی پائی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جو عبادت محض رسم کی خانہ پری بن کر رہ جائے گی وہ روحوں اور دلوں پر کیا اثر انداز ہو سکتی ہے؟ اسی وجہ سے حج کا حقیقی فائدہ بہت کم لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارے اہلِ علم کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآنِ مجید اور احادیث میں حج کے شعائر کے لیے شعائر کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے تو یہ لفظ ہی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ ان شعائر سے مقصود اصلی وہ معانی اور حقائق ہیں جو ان شعائر کے ذریعے سے ہمیں سمجھائے گئے ہیں۔'' (تزکیۂ نفس ج ۱ ص ۳۰۶-۳۰۷)

سورۂ مائدہ کی آیت ۲ میں حج کے حوالے سے فرمانِ الٰہی ہے کہ اے ایمان والو! شعائرِ الٰہی کی بے حرمتی نہ کرو۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۸ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ اس کی تفسیر میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی لکھتے ہیں:

''شعائر، شعیرہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان (symbol) ہو۔ اصطلاحِ دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے

رسول کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لیے بطور ایک نشان اور علامت کے مقرر کیے گئے ہوں۔ ان مظاہر میں مقصود بالذات تو وہ حقائق ہوا کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مقرر کیے ہوئے اللہ اور رسول کے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان حقائق کے تعلق سے یہ مظاہر بھی تقدیس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔'' (تدبرِ قرآن ج ا ص ۳۸۴)

اربابِ تصوف معرفتِ الٰہی کو خدا کی ذات کے ذریعے سے پانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ اس ضمن میں خدا ہمیں صفاتِ الٰہی کو ذریعہ بنانے کی ہدایت کرتا ہے۔ دیکھیے، حج جیسی جامع عبادت میں یہ حقیقت کس طرح نمایاں ہوتی ہے۔ مولانا وحید الدین خاں لکھتے ہیں:

''حج ایک اعتبار سے انسانی ذہن کی اصلاح ہے۔ حج کا پیغام یہ ہے کہ خدا کو ''مجسمہ'' کی سطح پر اتارنے کی کوشش نہ کرو۔ خدا کو اس کے ''شعائر'' کی سطح پر دیکھو۔ موجودہ دنیا میں تم خود کو اس کی ذات کی سطح پر نہیں پا سکتے۔ البتہ تم اس کو آثار ذات کی سطح پر پا سکتے ہو۔ یہ شعائر وہ ہیں جو خدا کے معیاری پرستاروں کے عمل سے قائم ہوئے ہیں۔ یہ تاریخ کے ان لمحات کی مادی یادگاریں ہیں جب کہ خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست اتصال قائم ہوا۔ جب بندہ نے خدا کو پایا اور خدا نے اپنے کو بندہ کے لیے بے نقاب کیا۔

تاریخ کے وہ قیمتی افراد جنھوں نے خدا پرستی کو اس کی اعلیٰ اور معیاری شکل میں اختیار کیا۔ ان کے آثار ہی کا نام شعائر اللہ (خدا کی یادگاریں) ہے۔ انھیں شعائر کے درمیان تمام مراسمِ حج ادا کیے جاتے ہیں۔ ان سے دوری خدا سے دوری ہے اور ان سے وابستگی خدا سے وابستگی۔'' (حقیقتِ حج ص ۷۵)

حج، ایک ایسی جامع عبادت ہے جس نے تمام عبادات کی اصل اساسات براہِ راست یا بالواسطہ اپنے اندر جمع کر لی ہیں۔ ذیل کی سطور میں ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ کس طرح نماز، زکوٰۃ، روزہ، ہجرت، جہاد، قربانی، تذکیر کے عناصر حج کے مناسک میں کارفرما ہیں۔

نماز ہی کو لیں۔ حج کے مناسک میں طواف ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی طواف کا ''باطن'' واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآنِ مجید کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے ثابت ہے کہ طواف بھی درحقیقت نماز ہے۔ یہ نماز صرف خانہ کعبہ کے ارد گرد ہی ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کے سوا دنیا میں اور کہیں بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ اس نماز میں بندہ جب خانہ کعبہ کے ارد گرد دعائیں پڑھتا ہوا اس طرح چکر لگاتا ہے جس طرح شمع کے ارد گرد پروانہ چکر

لگتا ہے تو غافل سے غافل انسان کی روح بھی وجد میں آ جاتی ہے پھر جب آدمی خیال کرتا ہے کہ اس کی یہ نماز مشابہ نماز ہے اس نماز سے جو فرشتے عرشِ الٰہی کے ارد گرد پڑھ رہے ہیں تو ایک صاحبِ دل کے دل کی حالت ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے وہ حالت کسی طرح بھی لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔''(تزکیہ نفس ج ۱ ص ۲۸۸)

زکوٰۃ پر غور کریں۔ زکوٰۃ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عبادت ہے۔ حج کا اہتمام اور اس کے زادِ راہ کے انتظام میں آدمی جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ ظاہر ہے خدا ہی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ عام آدمی تو اپنے روزمرہ کے اخراجات کم کر کے ہی حج کے مصارف پورے کر پاتا ہے۔

روزے کی طرف ذہن منتقل کریں۔ روزہ رکھ کر جو کیفیت ایک بندے پر طاری ہوتی ہے، وہی کیفیت ایک حاجی کی احرام باندھنے کے بعد ہوتی ہے۔ جس طرح اس پر یہ احساس طاری رہتا ہے کہ وہ روزے سے ہے، لہٰذا اسے شہوت کی باتوں سے بچنا ہے اور گناہوں سے گریزاں رہنا ہے۔ جس طرح روزہ دار اگر روزے کے آداب کا خیال نہ رکھے تو اسے بھوک پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح ایک حاجی بھی اپنی ساری مساعی کو گناہ کی باتوں سے غارت کر سکتا ہے۔

ہجرت و جہاد کے حوالے سے سوچیں۔ ہجرت و جہاد کی عبادت بھی خدا کی نافرمانی کے ماحول سے نکلنے اور خدا کی راہ میں سرگرم ہو جانے کے جذبے کا نام ہے۔ حج میں بھی آدمی اپنے پروردگار کے لیے گھر بار چھوڑتا، شر سے خیر کی طرف بھاگتا اور حج کے دنوں میں ایک مجاہد کی طرح میدان میں خیمے لگا کر کبھی پڑاؤ اور کبھی سفر کے سخت مراحل سے گزرتا ہے اور ان میں پیش آنے والی تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔

احرام ایک سادہ اور ان سلا لباس ہے، جس کے ساتھ کوئی سلی ہوئی چیز نہیں پہنی جا سکتی۔ احرام باندھنا، اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے دنیا سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور زیب و زینت کی زندگی ترک کر کے وہ لباس پہن کر خدا کے حضور میں حاضر ہو گئے ہیں، جس لباس میں مردہ قبر میں اتارا جاتا ہے۔ پھر ہماری زبان پر 'لبیک اللّٰھم لبیک' کا وہ ورد شروع ہو جاتا ہے، جس سے ہمارے خدا کے حضور حاضری کے والہانہ جذبے کا اظہار ہوتا ہے، اور جس میں ہم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے اور اس کی یکتائی کا اعلان کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ شکر کا جذبہ خدا کے ساتھ تعلق کے سارے پہلوؤں میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

حجرِ اسود کو علامت کے طور پر اللہ کا ہاتھ قرار دیا گیا ہے۔ طواف کا آغاز اسے چوم کر یا اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کیا جاتا ہے۔ ہاتھ چومنا یا ہاتھ پر ہاتھ رکھنا قدیم عرب میں عہد معاہدے کی توثیق کا ایک طریقہ تھا۔ حاجی طواف

کے آغاز میں یہ عمل کر کے 'بسم اللہ، اللہ اکبر' کہہ کر وہ دعا پڑھتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہدِ وفا کی تجدید کی جاتی ہے۔

سعی، نصرتِ دین کے جذبے کی علامت ہے۔ اس کا پیکرِ اتم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ہے۔ جب وہ اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے قربان گاہ لے گئے تو صفا اور مروہ کے درمیان قربانی کو پھیرے دلائے۔ سعی میں ان پھیروں اور حضرت ہاجرہ کی اس دوڑ دھوپ کی نقل کی جاتی ہے جو انھوں نے اس بیابان میں پانی کی تلاش کے لیے کی۔ حضرت ابراہیم اور حضرت حاجرہ کا یہی عمل ہے، جو سعی کی صورت میں حج کا حصہ بن گیا ہے۔

سر منڈانا پرانے زمانے میں غلام بننے کی علامت تھی۔ جب کوئی شخص کسی کا غلام بن جاتا تو اس کا سر مونڈ دیا جاتا تھا۔ حاجی اپنا سر منڈا کر اللہ کا غلام بننے اور اس کا غلام رہنے کا علامتی اظہار کرتا ہے۔

عرفات کا وقوف، درحقیقت اپنے آپ کو خدا کے حضور میں کھڑا کر دینا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں یہ سنت قائم کی کہ خطبے اور دوپہر کی نمازوں کے بعد مغرب کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوئے اور اس وقت تک کھڑے دعا فرماتے رہے، جب تک سورج ڈوب نہیں گیا۔ اس دوران میں بندۂ مومن اپنے گناہوں کو یاد کرتا، ان کے لیے معافی مانگتا اور اپنی حاجات کی تکمیل کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔

مزدلفہ میں اگرچہ وقوف تو عرفات کے مقابلے میں مختصر ہوتا ہے، لیکن عرفات و مزدلفہ کے مابین یہ سفر معنوی طور پر جہاد کے سفر کی علامت بن جاتا ہے۔ ایک مقام پر رکے، پڑاؤ کیا، پھر اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس دوران میں نمازیں بھی جہاد سے علامتی مشابہت کی وجہ سے قصر پڑھی جاتی ہیں۔

منیٰ میں جمرات پر جو کنکریاں ماری جاتی ہیں ان کو کوئی شخص چاہے شیطان پر کنکریاں مارنا سمجھے یا ابرہہ کی فوجوں پر جو آسمانی سنگ باری ہوئی تھی، اس کی یادگار سمجھے، بہرحال یہ کنکریاں مارنا اللہ کے دشمنوں پر لعنت اور سنگ باری کی ایک علامت ہے اور اللہ و رسول نے اس یادگار کو حج کے مناسک میں اسی لیے محفوظ کر دیا ہے تاکہ حج، مسلمانوں کی جہاد کی روح کو بھی زندہ رکھے۔

جہاد میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کو حج میں قربانی کی صورت میں علامتی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ابراہیمی قربانی کی یادگار ہے۔ حاجی قربانی اس جذبے کے ساتھ کرتا ہے کہ جس طرح اس نے خدا کی خوش نودی کے لیے جانور قربان کیا ہے، اسی طرح اگر اس کے دین کو ضرورت پڑی تو وہ اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرنے

سے دریغ نہیں کرے گا۔ اسلام کے معنی بھی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینے کے ہیں۔ یعنی خدا کی مرضی اور اس کی پسند کے آگے آدمی اپنی کوئی پسند باقی نہ رکھے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے محبوب بیٹے حضرت اسماعیل کو جب خدا کی راہ میں قربان کرنے کا عزم کیا تو لفظ ''اسلام'' ہی کے پہلو سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''مسلم'' کے لقب سے نوازا۔ جہاد کے اسی پہلو کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمھارا جہاد حج ہے۔

حج کے مناسک میں کارفرما یہی فلسفہ ہے جس کے پیش نظر مولانا وحید الدین خاں صاحب نے حج کے بارے میں ایک خاص جذباتی اسلوب میں تحریریں لکھی ہیں۔ ذیل میں ان کی ایسی ہی تحریروں سے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ مناسکِ حج کے علمی اور جذباتی، دونوں پہلو نمایاں ہو جائیں:

''حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ آدمی جب سفر کر کے مقاماتِ حج تک پہنچتا ہے تو اس پر خاص طرح کی ربانی کیفیت طاری ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ''اپنی دنیا'' سے نکل کر ''خدا کی دنیا'' میں پہنچ گیا ہے۔ وہ اپنے رب کو چھو رہا ہے۔ وہ اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ وہ اس کی طرف دوڑ رہا ہے..... حج کے تمام مراسم اس بات کا عملی اظہار ہیں کہ آدمی اللہ کے لیے سرگرم ہے۔ اس نے اپنی زندگی اللہ کے گرد گھمار کھی ہے۔ وہ اللہ کے دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے۔ حشر کے میدان میں اللہ کے سامنے حاضری کی کیفیت کو آج ہی اس نے اپنے اوپر طاری کر لیا ہے۔ وہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ اللہ کی یاد کرنے والا ہے۔ وہ اسلام کو ایک عالمی حقیقت بنانے اور اس کو بین الاقوامی سطح پر رواج دینے کے لیے بے قرار ہے..... حج گویا حق تعالیٰ کی زیارت ہے۔ وہ دنیا کی زندگی میں اپنے رب سے قریب ہونے کی انتہائی شکل ہے۔ دوسری عبادتیں اگر اللہ کی یاد ہیں تو حج خود اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا ہے..... حاجی جب کعبہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ ایسا محسوس کرتا ہے گویا وہ خود ربِ کعبہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ کعبہ کا طواف اس حقیقت کا مظہر ہے کہ بندہ اپنے رب کو پا کر پروانہ وار اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ جب وہ ملتزم کو پکڑ کر دعا کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے گویا اس کو اپنے آقا کا دامن ہاتھ آگیا ہے جس سے وہ بے تابانہ لپٹ گیا ہے اور اپنی ساری بات اس سے کہہ دینا چاہتا ہے۔

اکثر حاجیوں کو دیکھا گیا ہے کہ ارکانِ حج کو ادا کرتے ہوئے وہ بس رٹی ہوئی دعائیں دہراتے ہیں یا کتاب ہاتھ میں لے کر اس سے پڑھتے رہتے ہیں۔ حج کی فقہی ادائیگی اگرچہ اس سے ہو جاتی ہے۔ مگر حج کے دوران ذکر و

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دعا سے جو چیز مطلوب ہے اس کا حق اس طرح ادا نہیں ہوتا۔ حج کے دوران آدمی پر وہ کیفیت گزرنی چاہیے جو حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان پر گزری تھی۔ مثلاً جب آدمی سعی کرتا ہے تو اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلنے چاہییں کہ خدایا تو نے اس سعی کے بعد ہاجرہ کے لیے برکت کا ابدی چشمہ جاری کر دیا تھا میری سعی کو بھی تو ایسی سعی بنا دے جس کے بعد میرے لیے خیر کے ایسے چشمے جاری ہو جائیں جو دنیا سے آخرت تک مجھے سیراب کرتے رہیں۔" (حقیقتِ حج ۴۳، ۴۴، ۴۶، ۴۸)

(جاری)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حمد

ضیاءالدین نعیم

حمد ربِ ذوالمنن

وہ لمحہ جب مجھے اللہ پر ایماں ہوا حاصل
حقیقت میں وہی لمحہ ہے میری عمر کا حاصل !
وہ دن جب شرک دل میں جاگزیں تھا، کیا بھیانک تھے !
عبادت رائیگاں یکسر ، دعائیں ساری لاحاصل
اُسی سے مانگنا میرے لیے وجہِ سعادت ہے !
عنایت ہے ، فقط اُس کی ، مجھے جو کچھ ہوا حاصل !
سکونِ قلب جس کو ڈھونڈتی پھرتی ہے اک دنیا
مجھے —— ذکرِ الٰہِ ذوالمنن میں —— ہو گیا حاصل
نعیم اللہ کنبہ جانتا ہے خَلق کو اپنا
نہ ہو گی خَلق کو دکھ دے کر خالق کی رضا حاصل

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خیال و خامہ

جاوید

مریم کے نام

[بچوں کے لیے]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تو مری جان، زمانے میں سنبھل کے رہنا — اس میں رہنے کے بُرے ڈھنگ بدل کے رہنا
جب بھی دیکھے کہ دگرگوں ہے یہ دنیا تیری — ہو فقط صلح کی تدبیر تمنا تیری
گھر کے آنگن ہی میں دیکھوں مہِ تاباں تجھ کو — زیب و زینت کی نمایش نہ ہو شایاں تجھ کو
تم کو جینا بھی ہے، مرنا بھی مسلماں ہو کر — دردمندوں کے لیے درد کا درماں ہو کر
نرم خوئی ہو ہر اک کام میں عادت تیری — علم و اخلاق کی دولت ہو سعادت تیری
اپنے اوقات کو ہرگز نہ پریشاں رکھنا — حسنِ تدبیر کو ہر شے میں نمایاں رکھنا

میں ترے گھر میں پرندوں کو چہکتے دیکھوں
تیری آغوش میں پھولوں کو مہکتے دیکھوں